رکشا والا

اور دوسرے افسانے

مرتبہ
سید محمد ہاشم

پہلا ایڈیشن

(ایک ہزار)

ستمبر ۱۹۴۶ء

قیمت فی جلد

عہ ۱۲

پبلشر

رئیس فاطمہ - ۹۱۶ یحییٰ پور - الہ آباد

آن تمام حضرات کے نام

جن کے

رشحات قلم اس مجموعہ میں

شامل ہیں۔

ایس۔ محمد ہاشم

فہرست مضامین

"افسانہ ماضی و حال"

"پہیلی بوجھنا" اور "کہانی کہنا" اسی قدر آسان ہیں جس قدر جھوٹ بولنا مگر کہانی کا پلاٹ مرتب کرنا اور اس کو انسانی زندگی کے دوش بدوش لا کھڑا کرنا اسی قدر دشوار ہے جتنا کہ جھوٹ کو حقیقت کا جامہ پہنا دینا یا حقیقت کی سرحد سے ملا دینا۔ عہد حاضر میں کہانی کہنے والے یا جھوٹ بولنے والے تو بکثرت ملیں گے مگر حقیقت بیان کرنے والے شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے۔ اردو کے افسانوی ادب پر اگر مذکورہ بالا باتوں کا اطلاق کیا جائے تو حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی۔ کہانی کہنے والے ہیں۔ جھوٹی باتیں بیان کرنے والے ہیں مگر حقیقت بیان کرنے والے یا تو عنقا ہیں یا اگر ہیں تو اس قدر کم کہ نہ ہونے کے برابر۔ اور جو ہیں بھی وہ اس قدر حقیقت سے ہمکنار ہو گئے ہیں کہ انھوں نے حیا و شرم اور تہذیب و تمدن کے دامن کو بھی تار تار کر دیا ہے۔ جو تحریریں ہر مذہب انسان کے لئے "ناگفتہ بہ" بن گئی ہیں۔

اردو کا افسانوی ادب پہلے طویل افسانوں سے مزین تھا جس میں غیر مرتب پلاٹ۔ بغیر کرداری ارتقا کے کردار۔ بھرتی کے واقعات اور بے ترتیب صورتیں پیش کی جاتی تھیں۔ اس عہد میں تنقیدی سرمائے کا فقدان ان کے نظام کی طرف پوری توجہ بھی نہ کرنے دیتا تھا۔ مصنف نے قصہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ "ایک تھا بادشاہ ..... تین کھونٹ شکار کرنے جاتا اور چوتھے کھونٹ کی اس کو سخت ممانعت ہوتی ..... مگر وہ اسی طرف جا نکلتا وہاں کسی حسین دوشیزہ

فہرست مضامین

فہرست مضامین

"افسانۂ ماضی و حال"

"پہیلی بوجھنا" اور "کہانی کہنا" اسی قدر آسان ہیں جس قدر جھوٹ بولنا
مگر کہانی کا پلاٹ مرتب کرنا اور اس کو انسانی زندگی کے دوش بدوش لا کھڑا کرنا
اسی قدر دشوار ہے جتنا کہ جھوٹ کو حقیقت کا جامہ پہنا دینا یا حقیقت کی سرحد سے
ملا دینا۔ عہد حاضر میں کہانی کہنے والے یا جھوٹ بولنے والے تو بکثرت ملیں گے
مگر حقیقت بیان کرنے والے شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے۔ اردو کے افسانوی
ادب پر اگر مذکورہ بالا باتوں کا اطلاق کیا جائے تو حقیقت خود بخود سامنے
آجائے گی۔ کہانی کہنے والے ہیں۔ جھوٹی باتیں بیان کرنے والے ہیں مگر حقیقت
بیان کرنے والے یا تو عنقا ہیں یا اگر ہیں تو اس قدر کم کہ نہ ہونے کے برابر۔ اور
جو ہیں بھی وہ اس قدر حقیقت سے ہمکنار ہو گئے ہیں کہ انھوں نے حیا و شرم
اور تہذیب و تمدن کے دامن کو بھی تار تار کر دیا ہے۔ جو تحریریں ہر مہذب انسان
کے لئے "ناگفتہ بہ" بن گئی ہیں۔

اردو کا افسانوی ادب پہلے طویل افسانوں سے مزین تھا۔ جس میں غیر مرتب
پلاٹ۔ بغیر کرداری ارتقا کے کردار۔ بھرتی کے واقعات اور بے ترتیب صورتیں
پیش کی جاتی تھیں۔ اس عہد میں تنقیدی سرمائے کا فقدان ان کے نظام
کی طرف پوری توجہ بھی نہ کرنے دیتا تھا۔ مصنف نے قصہ بیان کرنا شروع کر دیا۔
"ایک تھا بادشاہ ..... تین کھونٹ شکار کرنے جاتا اور چوتھے کھونٹ کی
اس کو سخت ممانعت ہوتی ..... مگر وہ اسی طرف جا نکلتا وہاں کسی حسین دوشیزہ

سے دوچار ہوتا...... پھر مصیبتوں اور آفتوں کا سلسلہ ہوتا...... مصیبتیں بھی ایسی ہوتیں کہ کبھی مرد سے عورت بنتا، کبھی بندر کے قالب میں اپنی روح حلول کرتا، کبھی طوطا بن کر جنگل جنگل پھل کترتا پھرتا۔ دیونی سے ملاقات ہوتی، کہیں پریاں استقبال کرتیں اور جہاں کچھ بنائے نہ بنتی وہاں پیر دستگیر مدد کے لئے آتے یا خواجہ خضرؑ رہنمائی کرتے، انجام کار کردار تکمیل مقصد کے بعد خوش و خرم وطن واپس لوٹتے ہیں "۔۔۔ افسانہ یوں ختم ہوتا ہے" جس طرح اُن کے دن پھرے اسی طرح اللہ سب کی مرادیں پوری کرے......

یہ دور بہت دن نہ چل سکا کہ حقیقت نے ناولوں کے ذریعہ سے اس بے سروپا دروغ بیانی کا پردہ چاک کرنا شروع کیا۔ فرضی واقعات کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔ سماجی حالات، سماجی واقعات کے ساتھ تاریخی پس منظر اور تاریخی واقعات نے بھی حقیقت بیانی شروع کی۔ ڈپٹی نذیر احمد عبدالحلیم شرر اور حکیم محمد علیخاں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ عرصہ دراز تک انکا طوطی بولتا رہا مگر زمانے کو یہ روش بھی پسند نہ آئی۔ بدلتے ہوئے زمانے نے ان لوگوں کو بھی علیحدہ کیا۔ زندگی کی دوڑ میں ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جو ان طوالت پسند نہ ہونے کے باعث مختصر انداز میں حقیقت بیان کر دیتے حقیقت خود ظاہر ہونے کی فکر میں لگی ہوئی تھی۔ اپنے اظہار کے لئے افسانے کو پسند کیا اور اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ پہلے تو داستانوں نے [illegible] العادت عناصر سے متعلق تھے مافوق الفطرت عناصر تو شرر کے عہد میں ختم ہو گئے تھے پھر بھی کوئی کوئی علمبردار ضرور باقی تھا مگر وہ بالکل نظر انداز کیا گیا۔ حقیقت نے بہ کروٹ زمانے کے ساتھ ساتھ لی۔ شاہی ختم ہوئی شاہانہ زندگی فنا

ہوئی۔ ظاہرداری مٹ گئی، حقیقت نمودار ہوگئی۔ زندگی کی تلخ حقیقتیں
بیان کی جانے لگیں۔ مگر تلخ حقیقتوں سے مراد "شلوار" یا "لحاف" نہیں بلکہ وہ
سلوٹیں جو انسانی زندگی کے ستھراؤ میں کھٹکتی رہیں یعنی شاہانہ زندگی کے بجائے
عام زندگی شروع ہوئی۔ اوسط درجہ کے طبقہ کی زندگی کی حقیقتیں سطح زندگی
پر ابھریں۔ ادنیٰ طبقہ کی پرآشوب زندگی ایسی نظر آئی جو واقعی حقیقت اور سو فیصدی
حقیقت تھی۔ انسانی زندگی کا مقصد کیا تھا؟ دنیا کن لوگوں کی تھی؟ زندگی
میں سب سے زیادہ قربانی کس کو کرنا پڑی؟ کس کس بے بسی کے عالم میں کن
لوگوں نے زندگی گذاری؟ سماج نے کیا کس طرح غریبوں اور بیکسوں کے خون کو
چوس کر خود زندہ رہتے۔ غرض اردو کے افسانوی ادب میں، عوام کے مجازی خدا کی
بہت کم جگہ رہ گئی اور وہ تمام باتیں پیدا ہوگئیں جو در اصل "زندگی" ہیں اور جو
زندگی کی دوڑ میں قدم قدم پر ہمارے سامنے موجود رہتی ہیں۔

عہد جدید کی افسانوی پیداوار میں سب سے نمایاں تبدیلی موضوع کی ہوئی۔
موضوع بدلا، ماحول بدلا، رنگ و روپ بدلا۔ غرضکہ چولا کا چولا بدلا، کتنے کا کتنا بدل
گیا۔ اردو ادب آج ان لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا حامل نظر آنے لگا ہے
جن کی زندگی کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ پریم چند نے ضرور کچھ کوشش
کیں مگر ان کو سمجھنے کے لئے ایک ایسے ماحول سے واقفیت ہونا ضروری ہے جو ہندوستان
کے دیہاتوں سے متعلق ہے۔ ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں جن میں شہروں کی مجروح
اور لاچار آبادی کی زندگی پیش کی گئی ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں نے مرتب کیا ہے۔ اور اس خیال سے اس میں ہر دو رنگ کی

سے دوچار ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر مصیبتوں اور آفتوں کا سلسلہ ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ مصیبتیں بھی ایسی ہوتیں کہ کبھی مرد سے عورت بنتا، کبھی بندر کے قالب میں اپنی روح حلول کرتا، کبھی طوطا بن کر جنگل جنگل پھل کترتا پھرتا۔ دیونی سے ملاقات ہوتی، کہیں پریاں استقبال کرتیں اور جہاں کچھ بنائے نہ بنتی وہاں پیر دستگیر مدد کے لئے آتے یا خواجہ خضر رہنمائی کرتے، انجام کار کردار تکمیل مقصد کے بعد خوش و خرم وطن واپس لوٹتے ہیں ۔۔۔ افسانہ یوں ختم ہوتا ہے " جس طرح اُن کے دن پھرے اسی طرح اللہ سب کی مرادیں پوری کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ دور بہت دن نہ چل سکا کہ حقیقت نے ناولوں کے ذریعہ سے اس بے سروپا دروغ بیانی کا پردہ چاک کرنا شروع کیا۔ فرضی واقعات کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔ سماجی حالات، سماجی واقعات کے ساتھ تاریخی پس منظر اور تاریخی واقعات نے بھی حقیقت بیانی شروع کی۔ ڈپٹی نذیر احمد عبدالحلیم شرر اور حکیم محمد علیخاں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ عرصہ دراز تک انکا طوطی بولتا رہا مگر زمانے کو یہ روش بھی پسند نہ آئی ۔ بدلتے ہوئے زمانے نے ان لوگوں کو بھی علیحدہ کیا۔ زندگی کی دوڑ میں ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جو ان طوالت پسند نہ ہونے کے باعث مختصر انداز میں حقیقت بیان کر دیتے۔ حقیقت خود ظاہر ہونے کی فکر میں لگی ہوئی تھی۔ اپنے اظہار کے لئے افسانے کو پسند کیا اور اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ پہلے تو ہی افسانے [illegible] العادت عناصر سے متعلق تھے مافوق الفطرت عناصر تو شرر کے عہد میں ختم ہو گئے تھے پھر بھی کوئی کوئی علمبردار ضرور باقی تھا مگر وہ بالکل نظر انداز کیا گیا۔ حقیقت نے یہ کروٹ زمانے کے ساتھ ساتھ لی۔ شاہی ختم ہوئی شاہانہ زندگی فنا

سے دوچار ہوتا ...... پھر مصیبتوں اور آفتوں کا سلسلہ ہوتا ...... مصیبتیں بھی
ایسی ہوتیں کہ کبھی مرد سے عورت بنتا، کبھی بندر کے قالب میں اپنی روح حلول
کرتا، کبھی طوطا بن کر جنگل جنگل پھل کترتا پھرتا۔ دیونی سے ملاقات ہوتی، کہیں پریاں
استقبال کرتیں اور جہاں کچھ بنائے نہ بنتی وہاں پیرِ دستگیر مدد کے لئے آتے یا خواجہ خضرؑ
رہنمائی کرتے، انجام کار کردار تکمیل مقصد کے بعد خوش و خرم وطن واپس لوٹتے
ہیں" ــــــ افسانہ یوں ختم ہوتا ہے "جس طرح اُن کے دن پھرے اسی
طرح اللہ سب کی مرادیں پوری کرے ......

یہ دور بہت دن نہ چل سکا کہ حقیقت نے ناولوں کے ذریعہ سے اس بے
سروپا دروغ بیانی کا پردہ چاک کرنا شروع کیا۔ فرضی واقعات کو حقیقت کا جامہ
پہنایا۔ سماجی حالات، سماجی واقعات کے ساتھ تاریخی پس منظر اور تاریخی واقعات
نے بھی حقیقت بیانی شروع کی ڈپٹی نذیر احمد عبدالحلیم شرر اور حکیم محمد علیخاں کو
اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ عرصہ دراز تک انکا طوطی بولتا رہا مگر زمانے کو یہ
روش بھی پسند نہ آئی۔ بدلتے ہوئے زمانے نے ان لوگوں کو بھی علیحدہ کیا زندگی
کی دوڑ میں ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جو ان طوالت پسند نہ ہونے کے باعث
مختصر انداز میں حقیقت بیان کر دیتے حقیقت خود ظاہر ہونے کی فکر میں لگی
ہوئی تھی۔ اپنے اظہار کے لئے افسانے کو پسند کیا اور اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔
پہلے تو یہ افسانے خارق العادت عناصر سے متعلق تھے مافوق الفطرت عناصر تو شرر
کے عہد میں ختم ہو گئے تھے پھر بھی کوئی کوئی علمبردار ضرور باقی تھا مگر وہ بالکل نظر انداز کیا گیا۔
حقیقت نے یہ کروٹ زمانے کے ساتھ ساتھ لی۔ شاہی ختم ہوئی شاہانہ زندگی فنا

ہوئی۔ ظاہرداری مٹ گئی، حقیقت خود نمودار ہوگئی۔ زندگی کی تلخ حقیقتیں بیان کی جانے لگیں۔ مگر تلخ حقیقتوں سے مراد "شلوار" یا "لحاف" نہیں بلکہ وہ سلوٹیں جو انسانی زندگی کے ستھراؤ میں کھٹکتی رہیں یعنی شاہانہ زندگی کے بجائے عام زندگی شروع ہوئی۔ اوسط درجے کے طبقہ کی زندگی کی حقیقتیں سطح زندگی پر ابھریں۔ ادنیٰ طبقہ کی پُر آشوب زندگی ایسی نظر آئی جو واقعی حقیقت اور سوفیصدی حقیقت تھی۔ انسانی زندگی کا مقصد کیا تھا؟ دنیا کن لوگوں کی تھی؟ زندگی میں سب سے زیادہ قربانی کس کو کرنا پڑی؟ کس کس میرسی کے عالم میں کن لوگوں نے زندگی گذاری؟ سماجی لیوتا کس طرح غریبوں اور بیکسوں کے خون کو چوس کر خود زندہ رہتے۔ غرض اُردو کے افسانوی ادب میں، عوام کے مجازی خدا کی بہت کم جگہ رہ گئی اور وہ تمام باتیں پیدا ہوگئیں جو دراصل "زندگی" ہیں اور جو زندگی کی دوڑ میں قدم قدم پر ہمارے سامنے موجود رہتی ہیں۔

عہد جدید کی افسانوی پیداوار میں سب سے نمایاں تبدیلی موضوع کی ہوئی۔ موضوع بدلا، ماحول بدلا، رنگ و روپ بدلا۔ غرضکہ چولا کا چولا بدلا، کتنہ کا کتنہ بدل گیا۔ اُردو ادب آج ان لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا حامل نظر آنے لگا ہے جن کی زندگی کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ پریم چند نے ضرور کچھ کوششیں کیں مگر ان کو سمجھنے کے لئے ایک ایسے ماحول سے واقف ہونا ضروری ہے جو ہندوستان کے دیہاتوں سے متعلق ہے۔ ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں جن میں شہروں کی محروم اور لاچار آبادی کی زندگی پیش کی گئی ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں نے مرتب کیا ہے۔ اور اس خیال سے اس میں ہر دو دور کی

ترجمانی ہوتی ہے یعنی تخیلی افسانے اور حقیقی افسانے دونوں موجود ہوں تخیلی افسانے میں، غلو، رنگینی اور اعلیٰ طبقہ کی زندگی کا صرف ایک ورق ہے حقیقی افسانے، زندگی کی دکھتی ہوئی رگ پکڑتے ہیں اور ان پر شدید ضربیں لگا کر ظاہر بیں کی نظروں میں اُن کی زندگی کو اور زیادہ مجروح کرتے ہیں۔ مگر وہ ان بھیانک تصویروں کے پردے میں عوام کو ان کی زندگی کے پست معیار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی دریغ سعی کرتے ہیں۔ غرض زندگی کے کھیل یہ دونوں رُخ لئے ہوئے ہیں۔

جہاں تک افسانے کے اصول کا تعلق ہے، ان میں ان کی پیروی کی بہت کوشش کی گئی ہے۔ فنّی نقطۂ نگاہ سے اس کو مکمل بنایا گیا ہے مختصر سرخی، آسانی سے سمجھ میں آنے والی اور اپنی طرف رجوع بھی کر لینے والی، مرتب پلاٹ، روزانہ زندگی کے واقعات۔ واقعات کا صحیح انتخاب پھر ان کا صحیح سلسلۂ بیان اور کردار نگاری کے بعض پہلوؤں کو مدِّنظر رکھا گیا ہے مجھے امید ہے کہ ٹکنیک کے لحاظ سے بھی یہ ایک مکمل چیز ہوگی۔

محمد ہاشم

"رکشا والا"

ترجمانی ہوتی ہے یعنی تخیلی افسانے اور حقیقی افسانے دونوں موجود ہوں۔ تخیلی افسانے میں، غلو، رنگینی اور اعلیٰ طبقہ کی زندگی کا صرف ایک ورق ہے۔ حقیقی افسانے، زندگی کی دکھتی ہوئی رگ پکڑتے ہیں اور ان پر شدید ضربیں لگا کر ظاہر بین کی نظروں میں اُن کی زندگی کو اور زیادہ مجروح کرتے ہیں۔ مگر وہ ان بھیانک تصویروں کے پردے میں عوام کو ان کی زندگی کے پست معیار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ غرض زندگی کے کھیل یہ دونوں رُخ لئے ہوئے ہیں۔

جہاں تک افسانے کے اصول کا تعلق ہے، ان میں ان کی پیروی کی بہت کوشش کی گئی ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے اس کو مکمل بنایا گیا ہے مختصر سرخی، آسانی سے سمجھ میں آنے والی اور اپنی طرف رجوع بھی کر لینے والی، مرتب پلاٹ، روزانہ زندگی کے واقعات۔ واقعات کا صحیح انتخاب پھر ان کا صحیح سلسلۂ بیان اور کردار نگاری کے بعض پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ٹکنیک کے لحاظ سے بھی یہ ایک مکمل چیز ہوگی۔

محمد ہاشم

"رکشا والا"

ترجمانی ہوتی ہے یعنی تخیلی افسانے اور حقیقی افسانے دونوں موجود ہوں تخیلی افسانے میں غلو، رنگینی اور اعلیٰ طبقہ کی زندگی کا صرف ایک ورق ہے۔ حقیقی افسانے، زندگی کی دکھتی ہوئی رگ پکڑتے ہیں اور ان پر شدید ضربیں لگا کر ظاہر ہیں کی نظروں میں اُن کی زندگی کو اور زیادہ مجروح کرتے ہیں۔ مگر وہ ان بھیانک تصویروں کے پردے میں عوام کو ان کی زندگی کے پست معیار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ غرض زندگی کے کھیل یہ دونوں رُخ لئے ہوئے ہیں۔

جہاں تک افسانے کے اصول کا تعلق ہے، ان میں ان کی پیروی کی بہت کوشش کی گئی ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے اس کو مکمل بنایا گیا ہے۔ مختصر سرخی، آسانی سے سمجھ میں آنے والی اور اپنی طرف رجوع بھی کر لینے والی، مرتب پلاٹ، روزانہ زندگی کے واقعات۔ واقعات کا صحیح انتخاب پھر ان کا صحیح سلسلۂ بیان اور کردار نگاری کے بعض پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ٹکنیک کے لحاظ سے بھی یہ ایک مکمل چیز ہو گی۔

ترجمانی ہوتی ہے یعنی تخیلی افسانے اور حقیقی افسانے دونوں موجود ہوں تخیلی افسانے میں غلو، رنگینی اور اعلیٰ طبقہ کی زندگی کا صرف ایک ورق ہے۔ حقیقی افسانے، زندگی کی دکھتی ہوئی رگ پکڑتے ہیں اور ان پر شدید ضربیں لگا کر ظاہر بین کی نظروں میں اُن کی زندگی کو اور زیادہ مجروح کرتے ہیں۔ مگر وہ ان بھیانک تصویروں کے پردے میں عوام کو ان کی زندگی کے پست معیار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ غرض زندگی کے کھیل یہ دونوں رُخ لئے ہوئے ہیں۔

جہاں تک افسانے کے اصول کا تعلق ہے، ان میں ان کی پیروی کی بہت کوشش کی گئی ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے اس کو مکمل بنایا گیا ہے مختصر سرخی، آسانی سے سمجھ میں آنے والی اور اپنی طرف رجوع بھی کر لینے والی، مرتب پلاٹ، روزانہ زندگی کے واقعات۔ واقعات کا صحیح انتخاب پھر ان کا صحیح سلسلۂ بیان اور کردار نگاری کے بعض پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے مجھے امید ہے کہ ٹکنیک کے لحاظ سے بھی یہ ایک مکمل چیز ہوگی۔

"رکشا والا"

اسکول کا گھنٹہ بجتے ہی مختلف درجوں سے لڑکیاں اس طور پر نکلیں جیسے خانہ صیاد سے بندھے ہوئے پرندے آزاد ہوئے۔ سڑک کے کنارے ایکے، تانگے اور موٹر کی قطاروں سے دور ایک رکشا والا بھی کھڑا تھا۔

لتا دیوی نے اُسے دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ رکشا والا اشارہ پاتے ہی آگیا.....

"پارک روڈ چلوگے.....؟" لتا نے پوچھا۔

'کیوں نہیں، دیوی جی!' رکشا والے نے جواب دیا۔

'اچھا لو یہ کتابیں، میں چندرا کو دیکھوں کہاں رہ گئی.....'

وہ تھوڑی دور جاکر پھر واپس آئی ——— "چلو جی معلوم نہیں وہ کہاں ہوگی"

رکشا والا چلا۔ گردشِ تقدیر کے ساتھ ساتھ اُس کے پیر سائیکل کے پیڈل پر گھومنے لگے۔ ایک تو مخالف گرم ہوا دوم تیز دھوپ، اس پر منزل مقصود کی دُوری۔ غریب رکشا والا پسینے سے شرابور ہوگیا۔ پھر بھی سائیکل کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ لتا پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ مزدور کی جفاکشی اور بے زبانی کا احساس اُس نے کیا اور گھبرا کر بولی: رکشا

والے! ذرا روکنا ——" رکشا والے نے فوراً بریک دبا یا۔ سائیکل آہستہ آہستہ رک گئی ....."

"دیکھو تو میرا فاؤنٹن پن گر گیا...." کتابیں اُلٹتے پلٹتے ہوئے لتا نے کہا —

"کہاں گرا — دیوی جی"

"شاید پیچھے سڑک پر پڑا ہوگا ——"

رکشا والے نے سڑک پر ادھر اُدھر دیکھا، ڈھونڈا اور دل ہی دل میں کہنے لگا —— "ہے کرشن بھگوان، لاج رکھنا۔ دیوی جی کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ رکشا والا چور ہے اور میں مجرم بنوں ——"

نصف گھنٹہ بعد لتا دیوی نے آواز دی —— رکشا والے —— سنو ....."

رکشا والا فوراً آیا .....

مِل گیا۔ کتابوں میں تھا "چلو لیکن ذرا آہستہ رفتار سے" ——

لتا اُس کا چہرہ دیکھتی رہی —

رکشا والے نے آہستہ آہستہ۔ چہرا ہے پہنچ کر دریافت کیا۔

"اب کدھر چلوں، سرکار"!

وہ دیکھو سامنے والا بنگلہ — دیکھ لیا نا .... اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے لتا نے بتایا —

کس کا بنگلہ ہے حضور؟ آہستہ آہستہ سائیکل چلاتے ہوئے

رکشا والے نے پوچھا۔

رتن ناتھ ایڈوکیٹ کا ہے۔۔۔۔۔۔سمجھ گئے۔۔۔؟

بہت اچھا۔۔۔۔۔

تھوڑی دور پہنچ کر گھوما۔۔۔۔

ارے یہ نہیں ——— وہ دیکھو سبز رنگ کا بنگلہ،

بائیں ہاتھ۔۔۔۔

سمجھ گیا دیوی جی۔۔۔۔۔

رکشا بنگلے پر پہنچا۔ لتا دیوی سینے سے کتابیں لگائے ہوئے

اُتری۔۔۔۔

ایڈوکیٹ صاحب اخبار پڑھ رہے تھے، لتا نے کہا:۔پتاجی!

رکشا والے کو کرایہ دے دیجئے۔۔۔؟

یہ کہتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ رتن ناتھ اخبار لئے ہوئے

لتا کے کمرے میں گئے اور بولے "اور کیا طے کیا تھا بیٹی۔۔۔؟

طے تو کچھ نہیں کیا، جو چاہے دے دیجئے۔ وہ بیچارہ بولے گا

کیا۔۔۔۔"

ارے بیٹی!۔۔۔۔۔ گردن ہلا کر بولے۔۔۔۔۔۔تم نہیں

جانتیں۔۔ یہ ہیں مزدور بچے۔ مزدوری لیتے وقت جھگڑا ضرور کرتے

ہیں۔۔۔"

"ہاں پتاجی! ہوتے تو ایسے ہی ہیں، لیکن یہ بہت نیک ہے"

۵

کچھ نہ ہوے گا۔۔۔۔۔'

ہاتھ کنگن کو عارضی کیا۔ابھی دیکھ لو ــــــ!

ایڈوکیٹ صاحب نے اپنے ملازم رامو کو بلایا اور کہا۔" رامو! رکشا والے کو چار آنے پیسے دیدو۔

بہت اچھا حجور۔۔۔'

رامو نے چار آنے پیسے جیب سے نکال کر رکشا والے کو دئے۔

کرایہ تو تین آنے ہیں سرکار! ایک آنہ آپ زیادہ دے رہے ہیں۔۔۔۔' رکشا والے نے کہا۔

'کوئی حرج نہیں۔۔۔۔" ایڈوکیٹ صاحب نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'نہیں سرکار! تین آنے سے زیادہ نہ لوں گا۔ مالک ناراض ہوگا۔۔۔۔'

لتا دیوی نے سنا۔ وہ باہر آئی اور کہا۔۔۔" مالک سے نہ بتانا"

"یہ تو چوری ہوئی، دیوی جی۔۔۔۔"

اچھا وہ تین آنے تو کرایہ کے ہوئے اور لو یہ ایک روپیہ انعام۔ اب تو چوری نہیں۔۔۔'

"یہ آپ کی مرضی ــــــ"

"رکشا والا کرایہ اور انعام لے کر آگے بڑھا۔۔۔۔۔"

" اور ہاں! سنو رکشا والے۔۔۔۔" لتا نے بلایا۔

رکشا والا واپس آیا۔

" میں بھول گئی۔کل ۹ بجے اسکول جاؤں گی۔ تم آجانا ـــــ"

"بہت اچھا......"

ٹھیک ۹ بجے رکشا والا دوسرے دن بنگلہ پہنچا۔سائیکل کی گھنٹی بجا کر اپنی حاضری کی اطلاع دی۔ رامو اس گھر کا ملازم تھا اور ردیج رہا۔ وہ کرسیوں کے پاس صاف کر رہا تھا گھنٹی کی آواز پر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کمر پہ دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے رکشا والے کے پاس آ کر کہنے لگا۔"تمھاری راہ بٹیا تکمت ہیں....."

"دیر تو نہیں ہوئی، رامو بھیا! رکشا والے نے پوچھا"

"ارے رام بھجو، دیر کچھ ناہیں ہوئی"

"کون ہے رامو! لتا نے اپنے کمرے کے اندر سے دریافت کیا"

"رکشا والا ، بٹیا ـــــ"

لتا نے چلمن سے جھانکا اور تلملا کر باہر آئی بولی۔ آگئے تم......"

اس کے بعد کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر مسکرائی اور کہا ـ ٹھیک ۹ بجا ہے۔ ہو وعدے کے سچے رکشا والے۔

لتا مسکراتی ہوئی اسی طرح کمرہ میں چلی گئی ۔رکشا والا رکشا کے قریب بیٹھ گیا اور بیڑی پینے لگا۔دس منٹ بعد لتا نے آواز دی ـــــ رکشا والے..."

رکشا والے نے فوراً بیڑی پھینک دی اور کمرے کے سامنے چلمن

کے قریب جا کھڑا ہو گیا۔ لتا کتابیں لے کر باہر آئی اور کہا "یہ کتابیں رکھو۔ میں بھوجن کر کے آئی۔"

تھوڑی دیر بعد لتا باہر آئی۔ اُس کی ساری دھانی رنگ کی تھی۔ اُس کے شباب کی معصومیت اور نیا زمندیوں نے دیا رِ حُسن میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ غریب رکشا والے کی مایوس نگاہیں اُس پر پڑیں اور کافر جوانی کی تعریف کی۔ لیکن دل ہی دل میں خاموش خاموش —

لتا دیوی رکشا میں بیٹھی اور کہا "چلو رکشا والے"

رکشا والا حُسن دل افروز کو عشق کے درشن پر لے کر چلا۔ لتا دیوی اپنی کتاب پڑھنے لگی اور رکشا والا پارک روڈ پر تیز بھاگ رہا تھا کہ یکا یک سائیکل کے پچھلے پہیئے میں ایک خار پیوست ہو گیا۔ رکشا والا بیچارہ رُک گیا۔

لتا دیوی نے گھبرا کر پوچھا "کیوں رُک گئے رکشا والے؟"

"پنچر ہو گیا سرکار" کانٹا نکالتے ہوئے رکشا والے نے مایوس لہجہ میں جواب دیا۔

"تو تم اُداس کیوں ہو گئے۔ یہ لو تین روپئے۔ جاؤ جو ٹوٹا پھوٹا ہو بنوا لو"

"مہربانی دیوی! لیکن آپ جائیں گی کیسے.....؟"

اس کی چنتا نہ کرو، دور ہی کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیس قدم۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔

"آپ کو تکلیف ہوئی....." رکشا والے کا سر جھک گیا۔

"اونہہ..." لتا مسکرائی اور پھر کہا..." ہو بڑے شرمیلے...." اس کے بعد مسکراتی ہنستی چلی گئی۔

رکشا والا بظاہر مزدور تھا۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ وجیہہ تھا، خوبصورت تھا، اور ایک تعلیم یافتہ شخص تھا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد ستم روزگار سے مجبور ہو کر جب کہیں جگہ نہ ملی تو رکشا چلانے پر نوکری کر لی۔ لوگ اسے رکشا والے کے نام سے پکارنے لگے۔

وہ تین بجے سائیکل کی مرمت کرا کے اسکول پہنچ گیا۔ اور ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر لتا دیوی کی پیہم ناز برداریوں پر غور کرنے لگا۔ حالانکہ گرم ہوا کے بگولے پیچ کھا کھا کر اٹھ رہے تھے اور سڑک بالکل خاموش تھی۔ کسی کسی وقت کوئی موٹر گرد میں لپٹی لپٹائی گذر جاتی تھی، اس پر بھی رکشا والے کی محویت میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد گھنٹہ اسکول کا بجا۔ اور گھنٹے کی جھنکار سے دوسرے اکیّے، تانگے والے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ مگر رکشا والا اس وقت بھی نہ اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد سراپا ناز لتا دیوی آئی اور چندرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے آواز دی۔ "رکشا والے..."

وہ چونک کر اٹھا۔ چندرا کو اس کی سراسیمگی پر ہنسی آگئی۔ لتا دیوی نے پوچھا۔ "کس سوچ میں ہو رکشا والے....؟"

"کچھ نہیں سرکار!" رکشا والے نے ذرا ہیلو بچاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں، کچھ کھوئے کھوئے سے ہو..." لتا مسکرائی۔

"ارے نا دیوی جی! حساب جوڑ رہا تھا۔ آپ نے تین روپئے دئے تھے۔

۱۲ آنے سائیکل والے نے لئے اور اب رہے ۲ روپئے ۱۴ آنے وہ یہ ہیں۔ جیب سے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

تم رکھ لو۔ لتا نے واپس کرتے ہوئے کہا۔

لتا اور چندرا رکشا میں بیٹھ گئیں۔ رکشا والا آہستہ آہستہ چلا رفتار زیادہ تیز نہ تھی۔!

آج تو شرما بابو بھی سینما چلیں گے، لتا نے کہا۔

کیا معلوم ۔۔۔۔، چندرا نے جواب دیا۔

رکشا تیزی سے بھاگ رہا تھا۔

واہ اُن کا وعدہ ہے، لتا نے کہا۔

ایسے تو وعدے وہ روز کرتے ہیں ——— !

تم جھوٹ موٹ کا الزام نہ رکھا کرو۔۔۔، لتا بولی۔

دور ہی کیا دیکھ لینا۔۔۔،

تھوڑی دیر میں لتا کا بنگلہ آگیا۔ دونوں اُتریں۔ شرما بابو لتا کی ماں کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لتا نے اُترتے ہی دیکھا اور بولی۔ اب کہو چندرا ——— "ہیں نا شرما بابو۔!"

چندرا مسکرائی اور کہا ——— اُنہہ، ہوں گے۔ مجھے کیا،

اچھا، یہ بات۔، ذرا دل سے پوچھو، لتا نے چندرا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کمرہ میں جاتے ہوئے کہا۔

چندرا مسکراتی رہی اور ذرا عجیب نگاہوں سے ایک بار لتا کو دیکھ کر

بولی —"دل سے کیا پوچھوں۔ وہ بھی تو کہتا ہے ہوا کریں"
شرما بابو کمرے میں ایک بارگی آگئے اور تیز آواز سے بولے ——
"ہلو —تم آگئیں لتا"
لتا بولی۔ "آپ ہیں وعدے کے سچے .... میں مان گئی۔
اور جھوٹا مجھے کون کہتا ہے۔
زمانہ اور ساتھ ہی ساتھ چندرا بھی۔ لتا مسکرائی اور کہا۔
چندرا ایک شان بے نیازی کے ساتھ مسہری پر لیٹ گئی اور انگڑائی
لے کر کہا:۔" ہے رام! آج تو بہت تھک گئی .....
شرما بابو نے ایک نگاہِ لطف چندرا پر ڈالی اور بولے ...." زمانہ
کے لیکن چندرا پر مجھے اعتبار ہے"
جی ہاں۔ اعتبار ہی اعتبار پر جیے جائیے۔ لتا ہنسی اور طنز یہ جملہ
ادا کیا۔
"کیوں چندرا .....، یہ صحیح ہے۔ شرما بابو نے پوچھا۔
میں کیا جانوں"۔ آہ سرد بھرتے ہوئے چندرا نے جواب دیا۔
"دکھتی کیوں نہیں .... لتا نے ہنستے ہوئے چندرا کو گدگدایا۔
چندرا زور زور سے ہنسنے لگی بولی ...." اب کیا کہوں۔ کہہ تو دیا وعدہ
آسان ہے .....،
اور وعدے کی وفا مشکل ہے۔ یہ بھی تو کہو ...." لتا نے ہنس کر
کہا —"

"ضرور ــــ" چندرا خوشی کے ڈھلکتے ہوئے آنسو رومال سے پونچھتے ہوئے اٹھی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

اُس کے بعد اچانک آواز آئی ......لتا...؛

"ہاں ماتا جی! کہیئے ــــ!"

رکشا والا کھڑا ہے، کچھ کہو گی بھی۔ آخر وہ کل کس سمے آئے...؛

"ہائے رام! میں تو بھول ہی گئی تھی...... چپکے سے کہا اور فوراً باہر آکر رکشا والے کو بلا لیا۔

رکشا والا بیچارہ قریب آیا۔ لتا اُسے کمرہ میں لے گئی۔ شرما بابو نے اُسے دیکھا۔ لتا نے شرما بابو سے کہا:۔

شرما بابو! "یہ بہت نیک اور شریف رکشا والا ہے"

شرما بابو۔ تم کچھ پڑھے لکھے ہو؟

رکشا والا۔ زیادہ تو نہیں حضور! کچھ یوں ہی الٹی سیدھی لکیریں لکھ پڑھ لیتا ہوں۔

چندرا۔ لیکن بات چیت تمھاری بہت صاف ہے۔

رکشا والا۔ یہ آپ ہی لوگوں نے سکھایا ہے۔

لتا دیوی۔ تم کل بارہ بجے آسکتے ہو۔

رکشا والا۔ جو حکم ہو دیوی جی۔

لتا دیوی۔ تو کل آنا۔

رکشا والا۔ بہت اچھا۔

شرما بابو اُس کے رنگ روپ اور گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور سمجھ گئے کہ افلاس کے پردہ میں اُس کی شان کبیری چھپی ہوئی ہے جو غربت اور بیکسی کے باعث نشوونما نہ پا سکی - اُس نے رکشا والے سے پوچھا -
تمہارا نام کیا ہے ؟
رکشا والا - شیام منوہر -
شرما بابو - مجھے شک ہے کہ تم مزدور نہیں ہو -
لتا دیوی - ہاں شرما بابو ! میرا بھی یہی خیال ہے - میں آج ہی پتا جی سے کہوں گی کہ ان کو ملازم رکھ لیں - یہ ہیں بڑے کام کے - !
رکشا والا - ارے تا دیوی جی ! یہ آپ لوگوں کا خیال ہے -
لتا دیوی - نہ سہی مگر میری مرضی یہی ہے اور شاید تم انکار نہ کرو گے -
رکشا والا - نہیں دیوی جی ! مجھے معاف کیجئے - مزدور اپنی گدڑیوں میں زیادہ خوش رہتا ہے -
چندرا - اور گدڑیوں میں لعل بھی تو ہوتے ہیں -
بھئی ! اگر یہ لعل ہیں تو فائدہ ہے .... " شرما بابو کہہ کر ہنسے اور جیب سے سگریٹ نکالا -
رکشا والا کچھ شرما سا گیا اور شرمائی ہنسی ہنس کر بولا " سرکار کا خیال ہے وہ نہ رات کی سیاہی میں لپٹی ہوئی روشنی کس کام کی -
لتا مسکرائی اور فوراً بولی ——" سچ کہتے ہو مگر رات کا پھیلا ہوا اندھیرا سمٹ سمٹ کر روشنی کی گود میں سو جاتا ہے .... "

شرما بابو۔ تم نے کبھی کوئی پکچر دیکھا ہے۔
رکشا والا۔ جی ہاں! "منزل ــــــ"!
چندرا۔ کچھ سمجھ میں آیا۔
رکشا والا۔ جی ہاں، صرف اتنا سمجھا ہوں کہ جیون منزل ایک ہے اور راہیں دو ــــ"؟

رکشا والے کا جواب فانی حیات کا ایک نقشہ تھا، جس کو سن کر شرما بابو کی گردن جھک گئی۔ چندرا خاموش تھی اور لتا ایکبارگی آبدیدہ ہو گئی۔ کمرہ عالم سکوت میں گھر گیا اور رکشا والا بھی خاموش کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد لتا نے سر اٹھایا۔ اور ایک کمزور آواز سے کہا "تم جا سکتے ہو رکشا والے......"

سینما ہال میں کافی مجمع تھا۔ کیونکہ "پکار" پہلی بار آیا تھا فرسٹ کلاس میں شرما بابو، چندرا اور لتا دیوی بیٹھے تھے اور دوسری تیسری قطار میں دوسرے تماشائی بیٹھے سگریٹ اور سگار پی رہے تھے۔ ٹھیک سات بجے آپریٹر نے تیسری گھنٹی بجائی اور متحرک تصویریں پردۂ سیمین پر چلنے لگیں۔ "پکار" کا پلاٹ عہد جہاں گیری کے تاریخی واقعات پر مبنی تھا۔ جہانگیر کا انصاف، رعایا پروری اور نور جہاں کی محبت کے تاثرات سے لتا دیوی کے جذبات محبت ابھر آئے۔ تماشا ہوتا رہا، لیکن لتا دیوی کی نظریں پردۂ سیمین پر نہ تھیں۔ تھوڑی دیر بعد تماشہ ختم ہوا۔

اور تماشائی باہر نکلے۔ لتا چندرا کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر آئی اور تانگے میں بیٹھ رہی تھی کہ ایک شخص اُس کے سامنے سے گذرا۔ ایک بارگی اُس کی زبان پر نام آیا۔ "رکشا والا......" چندرا چونک گئی پوچھا "کہاں؟"

وہ دیکھو، چھریرہ جسم، ہاتھ میں ٹھا ستھ لئے ہوئے اور سیاہ سوٹ۔"

شرما بابو۔ خواب دیکھ رہی ہو کیا۔ وہ کہاں سے آیا اور ہے اگر تو گدڑیوں میں ہوگا۔

ہوگا۔ ممکن ہے میری آنکھوں کا قصور ہو۔ چلو ——— لتا دیوی نے ظاہرا لاپرواہی کے ساتھ کہا ———

صبح ۹ بجے چندرا اپنے بنگلہ سے آئی۔ آج اتوار کا دن تھا۔ اسکول میں چھٹی تھی۔ اُس نے لتا دیوی سے پوچھا۔ سچ بتاؤ۔ کل سینما میں رکشا والے کو دیکھا تھا......؟"

لتا دیوی۔ ہاں۔

چندرا۔ لیکن تم کہتی ہو کہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ یہ سمجھ میں نہ آیا۔

'ہاں بہن! کہنا مانو۔ وہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔' لتا مسکراتی رہی۔

'اچھا آنے دو۔ اگر یہ بات ہے تو ہے کوئی بڑا آدمی، لیکن دکھ درد سے بھرا۔' چندرا نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

'میں نے ۱۲ بجے بلایا ہے۔ ذرا گھڑی دیکھنا۔'

'ابھی دس بجا ہے......' چندرا نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"بہت بے چین ہو۔ ایشور تمھیں سُکھ دیں۔ چائے تو پیو۔۔۔" چندرا بسکٹ کھا رہی تھی۔

"کیا پیوں۔ اچھی نہیں معلوم ہوتی ـــــــ" لتا نے ایک بسکٹ کا ٹکڑا کھایا۔

"ہاں ہاں! کیوں اچھی لگے گی۔ وہ بیچارہ تو گرم پانی کو بھی ترستا ہوگا۔"

"نہیں نہیں! ایسا نہ کہو ـــــــ"

"پھر کیا کہوں، نہ تم چائے پیتی ہو اور نہ کچھ کھاتی ہو۔ کتاب کے اوراق اُلٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

"اب دیکھو کیا بجا ہے۔۔۔۔" لتا نے پوچھا۔

"گیارہ۔۔۔۔"

"ایک گھنٹہ اور ہے جلدی سے کٹے رام!" لتا کی کیفیت میں اضطراب تھا۔

"سوئی بارہ پر کر دوں ـــــــ" چندرا نے چٹکی لی۔

"ہشو۔ تم تو دل لگی کرتی ہو۔"

"پھر اور کیا۔ تمھاری بے چینی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ اچھا فرض کرو کہ وہ رکشا والا ہے۔۔۔۔"

"تو میں انھیں شیام بابو کہوں گی۔۔۔۔"

"لیکن میں تو رکشا والے کے نام سے پکاروں گی۔۔۔۔"

"کیوں۔۔۔۔؟"

"وہ رکشا والا ہے اِس لئے......"

"یہ تو کوئی بات نہیں۔ کرشن بھگوان ہی کو دنیا کبھی کرشن بھگوان کبھی کرشن کنھیا اور کبھی کرشن گوپال کے نام سے یاد کرتی ہے۔ لیکن ہیں تو بھگوان۔ وہ اپنے سچے بھگتوں کی رکھشا کرتے ہیں اور نت نئے اچھے اچھے اُپدیش سُنا کر چلے جاتے ہیں....." لتا نے جوشِ محبت میں کہا۔

"یہ تم بول رہی ہو یا رکھشا والے کا پریم!" چندرا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"جو کچھ سمجھو....." لتا نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"اور اگر وہ نہ آیا تو.......!" چندرا نے کہا۔

"کیسے کہوں.....،" لتا نے کہا۔

"اچھا یہ دیکھو ۱۲ بجا....."

"اب آتے ہوں گے.....!" لتا نے خوش ہو کر کہا۔

"بس آچکا۔ تم یونہی راہ دیکھتی رہو...!" چندرا نے ظاہرا مُنہ بناتے ہوئے کہا۔

"وہ آئیں گے چندرا!"

۲ اس کے بعد ایک بجا۔ پھر دو، پھر تین، اس کے بعد چار۔ اور اسی طرح شام ہو گئی لیکن وہ نہ آیا۔ لتا کا رنگ زرد ہو گیا۔ سر چکرانے لگا اسے عالمِ بیخودی میں ایک بار چندرا کو لپٹ کر کہنے لگی....." سُنو چندرا! گھنٹی بجی......وہ آئے....."

"وہ رکشا والا ہے اِس لئے۔۔۔۔۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں۔ کرشن بھگوان ہی کو دنیا کبھی کرشن بھگوان کبھی کرشن کنھیا اور کبھی کرشن گوپال کے نام سے یاد کرتی ہے۔ لیکن ہیں تو بھگوان۔ وہ اپنے سچے بھگتوں کی رکھشا کرتے ہیں اور نِت نئے اچھے اچھے اُپدیش سُنا کر چلے جاتے ہیں۔۔۔۔" لتا نے جوشِ محبت میں کہا۔

"یہ تم بول رہی ہو یا رکھشا والے کا پریم!" چندرا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"جو کچھ سمجھو۔۔۔۔" لتا نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"اور اگر وہ نہ آیا تو۔۔۔۔؟" چندرا نے کہا۔

کیسے کہوں۔۔۔۔، لتا نے کہا۔

"اچھا یہ دیکھو ۱۲ بجا۔۔۔۔"

اب آتے ہوں گے۔۔۔۔" لتا نے خوش ہو کر کہا۔

"بس آچکا۔ تم یونہی راہ دیکھتی رہو۔۔۔!" چندرا نے ظاہرا مُنہ بناتے ہوئے کہا۔

"وہ آئیں گے چندرا!"

۲ کے بعد ایک بجا۔ پھر دو، پھر تین، اِس کے بعد چار اور اسی طرح شام ہو گئی لیکن وہ نہ آیا۔ لتا کا رنگ زرد ہو گیا۔ سر چکرانے لگا اور عالمِ بیخودی میں ایک بار چندرا کو لپٹ کر کہنے لگی۔۔۔۔ "سُنو چندرا! گھنٹی بجی۔۔۔۔۔ وہ آئے۔۔۔۔"

اِس کے بعد اُس نے پکارا۔۔۔۔رکشا والے۔۔۔۔

چندرا فوراً باہر آئی لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔

وہ کمرہ میں واپس آئی ۔لتا دیوی کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ وہ مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔اُس کو دیکھ کر چندرا کا دل بھر آیا۔ وہ گھبرا گئی اور لتا سے پوچھا۔ سچ بتاؤ لتا۔ تمھیں اُس سے پریم ہے۔۔۔۔؟

لتا خاموش تھی مگر آنسوؤں کے قطرے اقرارِ محبت کر رہے تھے۔ لیکن چندرا کو اعتبار نہ تھا۔وہ باربار پوچھ رہی تھی ۔۔۔۔ بہن لتا! میں جانتی ہوں کہ دل کی لگی بُری ہوتی ہے۔ایک ہی بار ہاں یا نہیں کہہ دو۔۔۔۔۔

لتا کی ہچکیاں بندھ گئیں ۔۔۔

"چپ رہو لتا۔کیا کروں، اب وہ گیا۔کس سے کہوں کدھر جاؤں۔۔۔۔۔"

جانے کو جائیں لیکن ۔۔۔۔۔۔، لتا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔۔۔،

"مگر بہن! چاچا جی سنیں گے تو کیا کہیں گے۔۔۔۔"

پتا جی، انھیں رکشا والا اور ماتا جی انھیں مزدور سمجھتی ہیں مگر آنکھ والے دیکھتے ہیں کہ وہ کون ہیں کیا ہیں۔۔۔۔"

لتا نے میز پر سر جھکا کر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ ہچکیاں

لیتی رہی۔

"چپ رہو لتا۔ دیکھو میں شرما بابو سے کہوں گی ؛ شاید وہ پتہ چلا لیں"

لتا دیوی خاموش تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

چندرا بھی رو رہی تھی۔

لتا دیوی کی آس ٹوٹی، دل مرجھایا۔ لیکن...... چھ ماہ بعد......

بسنت کا تہوار جب آیا...... تو ایک روز۔

چندرا بسنتی ساری زیب تن کئے ہوئے لتا کے بنگلے پر آئی۔ رتن ناتھ ایڈوکیٹ، کرشنا دیوی ایڈوکیٹ کی بیوی اور شرما بابو ہال کمرہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ چندرا جوشِ شباب اور امنگوں کی لہروں سے کھیلتی ہوئی لتا دیوی کے کمرہ میں پہونچی۔ لتا کا چہرہ افسردہ تھا اور کتاب پڑھ رہی تھی۔ چندرا نے ہاتھ سے کتاب چھین لی اور کہنے لگی۔

"تم دیوانی تو نہیں ہوگئی ہو۔ واہ...... آج بسنت کا دن ہے۔ ابھی تک نہ ساری بدلی اور نہ کنگھا کیا۔ بت کی طرح بیٹھی ہو...... اٹھو منہ ہاتھ دھو ڈالو......"

چندرا کے کہنے سے منہ ہاتھ دھویا۔ چہرہ پر پوڈر ملا۔ ساری

بسنتی رنگ کی تبدیل کی اور دونوں ہال کمرہ میں آئیں ۔ شرما بابو اُٹھے اور کہا........" آیئے لتا دیوی..... "

لتا دیوی ۔ آپ بیٹھئے شرما بابو! میں دوسری کرسی پر بیٹھ جاؤں گی!

تھوڑی دیر بعد......

اخبار والا آیا ۔ اخبار رامو ملازم کو دے کر چلا گیا ۔ رامو نے لا کر اخبار ایڈوکیٹ صاحب کو دے دیا ۔ رتن ناتھ اخبار پڑھنے لگے ۔ پہلی سُرخی نہایت اُمید افزا تھی اور لتا دیوی کو حیات جاوید بخشتی تھی ۔ ایڈوکیٹ رتن ناتھ نے فوٹو دیکھا اور اُچھل پڑے "۔ لتا کی ماں! ذرا دیکھو تو ——— یہ فوٹو پہچانتی ہو...... "

کرشنا دیوی ۔ شرما بابو ۔ چندرا اور لتا دیوی سب جمع ہو گئے...... "

کرشنا دیوی ۔ یہ صورت کبھی دیکھی تو ہے ۔

رتن ناتھ ۔ اجی اُسی رکشا والے کی ہے...... کیوں لتا ـــ

لتا دیوی ۔ ہاں پتا جی! فوٹو.......! لتا بہت خوش ہوئی ۔

چندرا ۔ ہاں ہاں ۔ چاچا جی! میں پہچان گئی ۔

شرما بابو ۔ مگر صاحب ہے بڑا شریف ۔ مزدوری بھی کرتا رہا اور محنت بھی ۔ لیکن کبھی کسی سے کوئی سوال نہ کیا ۔ اور آج اپنی محنت سے ڈپٹی کلکٹر ہو گیا ۔

رتن ناتھ۔ اُس کا نام شیام منوہر ہے نا........!

شرما بابو۔ جی ہاں! یہی نام ہے۔ میں نے ایک دن پوچھا تھا۔

دفعتاً آواز آئی .... رکشا والا حاضر ہے دیوی جی....؛

لتا دیوی فوراً باہر آئی۔ شیام منوہر سیاہ سوٹ پہنے ہوئے رکشا کے قریب کھڑا تھا۔ لتا اُسے دیکھ کر مسکرائی۔ اُس کی مایوس آنکھوں میں خوشیاں جھومنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ قریب آئی اور حجاب سے سر جھک گیا......"

شبنم

میں آرام کرسی پر دراز کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ خانم کمرے میں داخل ہوئیں اور کتاب پر ہاتھ رکھ کر بولیں ۔ "سنتے ہیں آپ! میں خورشید جہاں سے ملنے جاتی ہوں ۔ مکان خالی ہے ۔ ذرا خیال رکھئے گا۔"

میں نے کہا " کیوں؟ کیا احمد اس کام کے لئے کافی نہیں؟"

"نہیں" خانم نے جواب دیا۔ "وہ میرے ساتھ جارہا ہے۔ ورنہ عشرت کو کون سنبھالے گا۔"

بیشک بات معقول تھی ۔ عشرت کی بے چینی سے خانم کی تفریح میں خلل واقع ہونے کا زبردست اندیشہ تھا۔ مزید سوال و جواب کی گنجائش نہ دیکھ کر میں خاموش ہو گیا۔ خانم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بیچاری مدت کے بعد میکے جا رہی ہے۔ دیکھو کب واپس ہوتی ہے ۔ مجھے تو اس کے بغیر چین نہ آئے گا۔"

میں کہنا چاہتا تھا۔ "بھولو نہیں ۔ میں تمہارے دل کو حقیقی راحت

پہنچا سکتا ہوں۔ تم میری طرف ملتفت ہو۔ مجھ سے محبت کرو تمھاری طبیعت بہل جائے گی" لیکن دفعتاً مجھے کسی افسانے کا یہ فقرہ یاد آگیا "محبت کرنے کی چیز نہیں۔ ہو جانے والی شے ہے" اور میں خاموش رہ گیا۔ خانم جیسے آئی تھیں ویسے چلی گئیں۔ مگر میری طبیعت میں ایک عجیب انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور اپنی بے کیف اور بے مزہ زندگی پر دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ افسوس میں دنیا کا وہ بدنصیب شخص تھا جس کی سات سالہ ازدواجی زندگی گوناگوں صدمات میں گزر رہی تھی۔ خانم گو نہایت خوش مزاج، روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھیں۔ لیکن میرے متعلق انھیں اپنی کسی ذمہ داری کا احساس نہ تھا۔ میری محبت بھی انھیں اپنی طرف نہ کھینچ سکی۔

اسی درمیان میں دہلی سے میری چھوٹی سالی سلمیٰ آگئی۔ وہ نہایت خوش مزاج، نیک اور ملنسار تھی۔ اپنے تمام عزیز اور پڑوسی سب اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ سب کے دلوں میں بسی تھی۔ ایک روز باتوں باتوں میں خانم کا ذکر چھڑ گیا۔ اس نے کہا "دولا بھائی باجی کے لئے آپ کی پریشانیاں بیکار ہیں۔ جب باجی کو آپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ آپ کی پروا نہیں کرتیں تو پھر آپ کیوں ان کے لئے اپنی جان ہلاک کرتے ہیں"

میں نے مایوس ہو کر کہا "سلمیٰ اپنی قسمت ہی خراب ہے۔ ورنہ

میری محبت ......"
سلمٰی نے فوراً بات کاٹ دی۔" میں نہیں مانتی۔ تقدیر کو آپ ناحق بدنام کرتے ہیں۔ آپ نے جو بویا ہے وہ ہی تو کاٹئے گا۔ نہ آپ باجی کے غلام بنتے اور نہ یہ حال ہوتا۔ بھائی جان! میں بھی عورت ہوں اور عورت کی فطرت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ جب آپ نے خود باجی کی غلامی قبول کر لی تو خواہ مخواہ کیوں آپ کے اثر میں رہیں۔"
سلمٰی کا خیال درست تھا۔ میں نے بھی آج پہلی بار محسوس کیا کہ میں نے اپنے پیروں میں خود کلہاڑی ماری ہے۔ کاش میری فطرت کمزور نہ ہوتی تو مجھے یہ غم نصیب نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔" ہاں۔ دیکھو نا۔ مَیں اُن کی محبت میں مٹا جاتا ہوں اور اُن کو میری موجودگی میں تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ گھر میں دل نہیں بہلتا۔ افسوس۔ مجھ سا بھی کوئی بدنصیب نہ ہوگا۔"
سلمٰی نے متاثر ہو کر کہا۔" دولا بھائی۔ صبح کا بھٹکا شام کو آجائے تو اُسے بھٹکا نہیں کہتے۔ مجھے یقین ہے کہ باجی بھی راہ راست پر آجائیں گی۔ لیکن آپ کو کچھ قربانی کرنی ہوگی۔"
" کیا؟" میں بے اختیار سوال کر بیٹھا۔" حالانکہ جانتا تھا کہ خانم کی طبیعت میں تغیر پیدا ہونا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔
سلمٰی نے کہا۔" آپ کو باجی کے لئے اپنا دل سخت کرنا ہوگا۔"
" یعنی" میں نے پھر سوال کیا۔

اِس پر سلمیٰ ہنس دی "یعنی اگر آپ باجی سے نفرت نہیں کر سکتے تو کم از کم محبت ضرور کم کرنی ہوگی"
میں خاموش ہو گیا۔
سلمیٰ نے کہا "میں پرسوں دہلی جانے کی تیاری کروں گی۔ مگر آپ مصر ہو کر روک لیجئے گا۔ اُس کے بعد خدا مددگار ہے۔
غرض میں نے سلمیٰ کو روک لیا۔ اُس سے خانم بھی خوش تھیں اور سلمیٰ کا تو گویا دلی منشا پورا ہو رہا تھا۔ وہ اکثر ازدواجی زندگی پر بحث کرتے ہوئے خانم کے جذبات اُبھارنے کی کوشش کرتی اور باتوں ہی باتوں میں میری تعریف بھی کرتی رہتی اور کہتی "باجی آپ بڑی خوش نصیب ہیں آپ کو ازدواجی زندگی کی مسرتیں حاصل ہیں۔ کاش خدا سب بہنوں کو دولہا بھائی جیسا نیک اور شریف شوہر دے اور سب آپ کی طرح خوشگوار زندگی بسر کر سکیں۔ واقعی آپ لوگوں نے ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔
لیکن خانم خاموش رہتیں اور اپنے دل پر کوئی اثر نہ لیتیں۔
دوسری طرف میرے لئے بھی سلمیٰ کی شوخیاں اور بیباکیاں بڑھ رہی تھیں۔ جذبات رفتہ رفتہ اُبھر رہے تھے۔ وہ جب میرے سامنے سے گزرتی تو بل کھاتی اور مسکراتی ہوئی۔ اُس کے ہر ہر انداز میں دلکشی پنہاں رہتی۔ روز شام کو جب میں دفتر سے واپس آتا اور مکان میں داخل ہوتا تو وہ مجھے مخمور کن انداز میں اپنی طرف مخاطب

کرلیتی اور میں اس کی مسکراہٹوں میں ایک عجیب کیفیت محسوس کرنے لگتا۔ لیکن جب خانم پر نظر پڑتی جو باورچی خانے سے مجھے دیکھتی ہوتیں تو میں بے چین ہو جاتا۔ گھبرا اٹھتا اور فوراً اپنے کمرہ میں چلا جاتا مگر سلمٰی کشتی میں ناشتہ لئے کمرہ میں آجاتی۔ چھوٹی میز پر ناشتہ سجا دیتی، کرسی میز کے قریب لاکر رکھ دیتی اور لوٹے میں پانی لے کر ہاتھ دھولانے کھڑی ہو جاتی۔ خانم کی نظریں اب بھی ہماری طرف رہتیں۔ میں جھجکتا ہوا اُٹھتا۔ منہ ہاتھ دھوتا اور ناشتہ میں مصروف ہو جاتا۔ سلمٰی خود میرے لئے پیالی میں چائے تیار کرتی اور جب تک میں ناشتہ کرتا رہتا وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی مجھے تفریح کی باتوں میں ہنسایا کرتی۔ میرا دل اُس کے محبت آمیز جذبات دیکھ کر مسرور ہو جاتا۔ سینہ میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ اور میں اُسے متشکر نگاہوں سے دیکھ کر فقرہ چست کر دیتا۔ بدسلمٰی۔ واقعی عرفان انتہائی خوش نصیب ہے کہ تم اُس کی شریک حیات بنی ہو۔“ اِس پر وہ شرما کر نگاہیں جھکا لیتی۔ اور میں قدرت کی ستم ظریفی پر افسوس کرتا باہر چلا جاتا۔ سلمٰی اور خانم دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ دونوں ایک ہی ماں کی گود اور ایک ہی ماحول میں پل کر جوان ہوئی تھیں۔ لیکن دونوں کی فطرت کتنی جدا اور دونوں کے مزاج کس درجہ مختلف تھے۔

درست ہے کہ عورتیں مردوں کے جیون نیا کی کھیون ہار ہیں۔

خواہ ڈبوئیں یا پار لگائیں۔ خانم کی بے فکریوں نے جس زندگی کو
میرے لئے عذاب بنا دیا تھا۔ اسے سلمیٰ کے پُر اخلاق سلوکات کچھ اس
طرح دل کش اور خوشگوار بنا رہے تھے کہ مجھے خود حیرت ہوتی تھی۔
میں زندگی کی راحتوں کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن میرا ضمیر مطمئن نہ
نہ تھا۔ خانم کی طبیعت کا انتشار دیکھ کر میری مسرتوں کی بنیادیں
ہل جاتی تھیں۔ میرے دل میں خوشی کی لہریں اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتیں
اور جذبات کا سیلاب امنڈ امنڈ کر رہ جاتا۔ کیونکہ میری زندگی کے
انقلاب سے خانم خوش نہ تھیں۔ وہ گو سلمیٰ کے خیال سے زبان
سے کچھ نہ کہتی تھیں مگر ان کا اضطراب پوشیدہ نہ تھا۔ ان کے تیور
سخت تھے اور نگاہیں تیز۔ مختصر یہ کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ
سلمیٰ میری خاطر اور دلجوئی میں اپنا کوئی لمحہ بھی صرف کرے۔ میں نے
خانم کی بےچینیوں کے پیش نظر ایک روز سلمیٰ سے کہا بھی کہ "تم
میرے خاطر اپنی باجی کو رنجیدہ نہ کرو۔ وہ تمہاری بیباکیوں کو غصہ
کی نظر سے دیکھتی ہیں اور نہیں چاہتیں کہ تم میری دلداری میں اپنا
وقت خراب کرو۔" لیکن سلمیٰ نے تیوریاں چڑھا کر شانِ خودداری
سے جواب دیا۔ "اونہہ" مجھے اس کی پروا نہیں کہ باجی کو میری کیا
بات پسند ہے اور کیا نہیں۔ آپ ہی ان کی تیوروں سے ڈرتے
اور کانپئے۔" اور باورچی خانے میں چلی گئی۔
سلمیٰ کا یہ جواب مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ حالانکہ جانتا تھا کہ وہ مجھ پر

بھی میرے ساتھ کر رہی تھی۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کر رہی تھی۔
اس کی شوخی اور بیباکی کے پردہ میں کوئی خاص جذبہ پوشیدہ نہ تھا۔
پھر بھی مجھ پر ایک قسم کی سراسیمگی طاری تھی۔ دل دھڑکتا رہتا تھا۔
فی الحقیقت میں کسی قیمت پر بھی خانم اور عشرت کی راحتوں کا سودا نہیں
کرنا چاہتا تھا۔ میں زندگی میں مسرور رہنا چاہتا تھا مگر خانم کو رنجور
بنا کر نہیں۔ میں ہنسنا چاہتا تھا مگر خانم کو رلا کر نہیں۔ میں جینا چاہتا
تھا لیکن خانم اور عشرت کے سینوں میں غم کی برچھیاں چبھو کر نہیں۔
مجھے اب اپنی کمزوری پر رونا آتا تھا۔ کاش میں نے سلمٰی کو اپنی
داستانِ غم نہ سنائی ہوتی اور وہ میری ہمدردی پر آمادہ نہ ہوتی
تو آج میری دماغی الجھنوں میں ہرگز اضافہ نہ ہوتا۔ اُف! کتنا
بھیانک انجام تھا میری اپنی سازشوں کا۔ میرے ساتھ خانم
بھی بربادی کے غار میں گر رہی تھی اور ننھا عشرت اُن کی گود
میں تھا۔
بارہا میں نے یہ بھی سوچا کہ میں خود سلمٰی سے کہہ دوں کہ مجھے
اس کی دلجوئیاں پسند نہیں اور یا اُسے عرفان کے پاس دھکیل
پہنچا دوں۔ لیکن یہ خیال کر کے خاموش رہ جانا پڑا کہ اوّل تو
یہ اخلاق سے گری ہوئی بات تھی۔ دوسرے وہ ایک مدّت
کے بعد آئی تھی ممکن تھا میرا فیصلہ خانم کو ناگوار گذرتا اور ایک نئی
مصیبت کا سامنا ہو جاتا۔ غرض کسی صورت بات بنتی نظر نہ آتی تھی

اور میری پریشانیاں بدستور تھیں۔

ایک دن خانم اور سلمیٰ دونوں سینما گئی ہوئی تھیں اور میں کمرہ میں آرام کرسی پر دراز ناول دیکھ رہا تھا کہ سلمیٰ کمرے میں مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ میں نے حیرت سے سلمیٰ کو اور پھر گھڑی کو دیکھا۔ ابھی صرف آٹھ بجے تھے اور تماشا ختم ہونے میں کافی دیر تھی۔ میں نے پوچھا "کیوں؟ کیسے چلی آئیں؟ کیا تماشا پسند نہیں آیا؟"

سلمیٰ نے کہا "نہیں۔ تماشا تو اچھا تھا۔ مگر میرا دل نہیں لگا۔"

میں نے پھر سوال کیا "کیا تم اکیلی آئی ہو؟"

"جی ہاں" سلمیٰ نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا "باجی سے سر کے درد کا بہانہ کر کے چلی آئی۔"

معاً میرا دم سا گھٹ گیا "کیا کہا۔ سر کے درد کا بہانہ کر کے چلی آئیں؟"

سلمیٰ بولی ہاں! آپ کے خیال سے چلی آئی۔ سوچا کہ آپ تنہا بیٹھے تارے گنتے ہوں گے" اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مگر میری رگوں میں خون منجمد ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکن کمزور اور نبض سست ہو رہی تھی۔ اُف! میرا سر چکرا گیا۔ سلمیٰ کی شرارت آمیز حرکت میں اس کی وہ اُمنگ نمایاں تھی جو دلوں کے ساتھ محبت

کی بازیاں کھیلنے کو زندگی کا خاص شغل سمجھتی ہے سلمیٰ بھی غلط کاریوں پر
ریجھ رہی تھی، یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس کی لغزشیں اُس کی بہن
کے دل پر صدمات کی وہ ضربیں دیں گی کہ غریب جانبر نہ ہو سکے گی۔
افسوس! میں خطرات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی خاموش تھا۔
زبان ہلانے کی گنجائش نہ تھی۔ مجھے خاموش اور متفکر دیکھ کر سلمیٰ
نے پھر کہا " دولا بھائی! مجھے باجی پر انتہائی غصہ آ رہا ہے کہ انھوں
نے آپ کو بھی سینما کے پروگرام میں کیوں نہیں شامل کیا "
میں نے بے دلی سے بات ٹالنے کی غرض سے کہا " میں خود سا تھ
جانا پسند نہیں کرتا تھا " اور پھر ناول دیکھنے لگا سلمیٰ کرسی کھینچ کر میرے
قریب آ گئی۔ اور میرے ہاتھ سے کتاب لے کر بولی " دولا بھائی! میں
تماشا چھوڑ کر آپ کی خاطر سے چلی آئی اور آپ ناول میں اُلجھے ہیں "
میں نے کہا " سلمیٰ! تم نے غلطی کی جو چلی آئیں "
" کیوں ؟ " اُس نے شوخی سے مسکرا کر کہا۔
" کیونکہ مجھے تفریح کی کوئی ایسی بات نہیں آتی جس سے تمہارا
دل بہل سکے " میں نے بے فکرانہ انداز میں کہا۔ اور سگریٹ کا کش لیکر
کرسی کے تکیہ سے لگ گیا۔
سلمیٰ نے کہا " کوئی کہانی ہی کہئے "
میں نے کہا " مجھے جھوٹی کہانیوں میں کوئی دلچسپی نہیں "
وہ ہنس دی " تو پھر اپنی ہی بات کیجئے "

میں نے کہا [illegible]ل باتوں سے فائدہ نہیں" اور خاموش ہو رہا
سلمی [illegible] [illegible]لابھائی! آپ کی زندگی میں حسین انقلاب
پیدا ہو رہا ہے۔ اور آپ خوش نظر نہیں آتے۔ کیا باجی کا ڈر
دامنگیر ہے"

میں نے سلمیٰ کے سوال کا جواب تیز نظروں سے دیا۔ وہ
زیرلب مسکرا دی۔

اتنے میں خانم کمرہ میں داخل ہوئیں۔ میری روح لرز گئی۔
مگر سلمیٰ پر کوئی نمایاں اثر نہ ہوا۔ اس نے کہا" باجی! دولابھائی
کی باتیں اس قدر دلچسپ تھیں کہ سر کا درد کافور ہو گیا"

خانم مسکراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میرا دھیان خانم کی
سانس کی آمدورفت پر تھا۔ ڈر رہا تھا کہ غم کی چوٹیں۔ اس کا سلسلہ
منقطع کر کے خانم کی زندگی نہ ختم کر دیں۔ مگر آفریں ہے خانم کے
اخلاق اور خودداری پر۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری تلخیوں کو شربت کے
گھونٹ کی طرح پی رہی ہیں۔ صورت سے بھی قلبی انتشار نہیں
ظاہر ہوتا تھا۔ سلمیٰ نے پھر ازدواجی زندگی پر مباحثہ شروع کر دیا۔

خانم مردوں کو خانگی جھگڑوں کا ذمہ دار ٹھہراتی تھیں
اور سلمیٰ عورتوں کو الزام دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نوّے فی صدی
جھگڑے عورتوں کی طرف سے شروع ہوتے ہیں جس کی جڑ عورتوں
کی نافرماں برداری، بے توجہی اور بدسلیقگی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عورت و مرد دونوں ہی کی کمزوریاں اور غلطیاں باہمی نفاق کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ کثرت سے خواتین کے دماغ زیادہ روشن نہیں ہوتے۔ ان میں تعلیم بھی کم ہوتی ہے اس وہ فی زمانہ مردوں کی فطرت کو صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر رہتی ہیں اور اکثر زندگیوں میں ہلاکت انگیز اثر پیدا کر لیتی ہیں۔

سلمیٰ نے کہا "خیر! خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ اخلاقی کمزوریوں سے پاک ہیں" اور نیند کا بہانہ کر کے کمرے سے چلی گئی۔ میرے منہ سے نکل گیا "بلا کی چلبلی اور شریر ہے"

معاً خانم کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا وہ جانے کے لئے کرسی سے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے انھیں خوش کرنے کے خیال سے کہا "

" دہلی سے آج تمہاری دعوت کا خط آیا ہے۔ اچھا ہے کچھ دن کو چلی جاؤ۔ دل بہل جائے گا۔

خانم نے کہا " اور آپ؟"

میں نے کہا " مجھے رخصت ملنی دشوار ہے"

خانم نے کہا " میرا مطلب ہے آپ کو یہاں تنہا تکلیف ہوگی"۔

آج پہلی بار میں اپنے لئے خانم کو اس طرح متفکر دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا " میری فکر نہ کرو۔ اور جانا چاہو تو چلی جاؤ"

خانم نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا " خیر سوچ کر

جواب دوں گی۔"

یہ کہہ کر خانم اپنے کمرے میں چلی گئیں اور میں سونے کے لئے بستر پر چلا گیا۔
لیکن ابھی نیند پختہ نہ ہوئی تھی کہ کمرے میں قدموں کی آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ اور
مجھے چاند کی ہلکی روشنی میں جو کھڑکیوں کے پردوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی اپنے
سرہانے کسی کا سایہ معلوم ہوا۔ میں نے سوچا۔ خانم ہوں گی لیکن گھوم کر دیکھا تو —
دم بخود رہ گیا۔ سلمیٰ مسہری کے تکیے سے لگی کھڑی تھی۔ اُس کے بال پشت پر بکھرے
تھے اور دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانوں پر آ گیا تھا۔ میں رضائی ایک طرف پھینک
کر اُس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اور اُس کے شانے جھنجھوڑ کر بولا۔ "یہ کیسی جرأت
سلمیٰ؟ کیا دیوانی ہو گئی ہو؟"

سلمیٰ نے میرے ہاتھ اپنے شانے سے جھٹک دیئے۔ "میں خواب دیکھ
رہی تھی شاید اسی خواب میں چلتی ہوئی یہاں چلی آئی۔"

میں نے پُر طیش لہجہ میں کہا۔ "خیر کچھ بھی ہو تم کو تمہاری سمجھ نے غلط راستہ
دکھایا۔ جانتی ہو خانم برابر کے کمرے میں سو رہی ہیں۔ اگر وہ جاگ گئیں اور تم کو
یہاں دیکھ پایا تو غضب ہو جائے گا۔ یہ مانا کہ خانم میں رشک و حسد کا مادہ کم ہے
اور وہ کبھی میری طرف سے مشتبہ نہیں ہوئیں تاہم خواب میں چل کر تمہارا یہاں
چلا آنا انہیں ہرگز گوارا نہ ہوگا۔ اور وہ ضرور رنجیدہ ہو جائیں گی۔ بہتر ہے تم ذرا
خاموشی سے واپس چلی جاؤ۔"

سلمیٰ نے میری باتوں کا کوئی اثر نہ لیا۔ اور بدستور بے حس کھڑی رہی۔
مجھے اُس کے اس تجاہل پر طیش آ گیا۔ میں نے کہا۔

سلمیٰ خانم درحقیقت پاگل ہوگئی ہو تمہیں اپنی عزت و آبرو کا خیال نہ سہی لیکن مجھے تو اپنی بربادی کا خوف ہے ۔ للہ اپنے کمرے میں چلی جاؤ ۔ میں خانم سے علیحدگی نہیں چاہتا ۔ مجھے اپنے بچے بھی بہت پیارے ہیں ۔ میں خانم کے جذبات اور خیالات کی اصلاح چاہتا تھا ۔ ان سے چھٹکارا نہیں "

اس پر سلمیٰ نے غصہ میں کہا ۔ تم یہ نہیں سمجھتی کہ میرا تمہارے پاس آنا گناہ ہے اور یہ بات کوئی پسند نہ کرے گا ۔ تمہارا آنا یہ بیہودگی ہے "

یہ کہہ کر سلمیٰ کھڑکی پر چلی گئی ۔ اس کی طبیعت میں کسی قسم کا انتشار نہیں معلوم ہوتا تھا ۔ میں نے چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھا ۔ وہ اس وقت بالکل حسین معلوم ہوتی تھی ۔ میرا دل بے اختیار اس کی رعنائیوں کی طرف کھنچنے لگا ۔ ساتھ ہی میں اس کشش میں ایسی ہی کیفیت رمیدگی اور ایسا لطیف درد محسوس کر رہا تھا کہ خدا کی پناہ! میرا شوق ابھر ابھر کر یہ ہی ترغیب دیتا تھا کہ اس وقت دنیا کو بھول کر اسے آنکھوں میں بٹھا لوں ۔ اس حسین مجسمہ کو ایک نظر دیکھنا ہرگز گناہ نہیں ہو سکتا ۔ مانا کہ میری وہ سالی تھی ۔ مانا کہ میری وہ سالی تھی لیکن میری آرزو صرف اتنی تھی کہ اسے دیکھتا رہوں ۔ اور اگر یہ گناہ بھی تھا تو میں اس وقت اسے ہنستے ہوئے دیکھ سکتا تھا ۔ میری تمنائیں دل کے گوشوں میں مچل رہی تھیں ۔ نظروں کے ساتھ قدم بھی بڑھے ۔ مگر لرزاں ۔ میں جھجک گیا ۔ خانم کے قدموں کی چاپ سنائی دی ۔ وہ میرے کمرے کی طرف آ رہی تھیں ۔ میرا دل ڈوب گیا ۔ ارمانوں کے حباب تفکرات کی لہروں سے ٹکرا کر چور چور ہو گئے ۔

میں نے فوراً سلمیٰ کو سہارا دے کر کمرے کے باہر کر دیا۔ اور دروازہ بند کر کے مسہری پر رضائی اوڑھ کر لیٹ رہا۔ خانم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا یہ آپ کس سے باتیں کر رہے تھے؟ اور بتی روشن کر دی۔

میرے خیالات منتشر تھے ہی۔ روح تک لرزاں تھی۔ کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور خاموش خانم کے چہرے کو تکتا رہا جس پر آج بھی شفقت نمایاں تھا۔ یکایک خانم کی حیران آنکھیں میری طرف سے ہٹ کر کمرے کے دروازہ پر جم گئیں جس سے سلمیٰ گئی تھی۔ اُف! یہ مجھے اب خبر ہوا دروازے میں سلمیٰ کے دوپٹہ کا ایک چھوٹا سا حصہ پھنس کر رہ گیا تھا۔ خانم سر سے پیر تک میں سارے جسم سے کانپ رہی تھی۔ میرا بھی دم گھٹ رہا تھا۔

کچھ دیر خانم سکتہ کے عالم میں سلمیٰ کے دوپٹہ کی چندی کو دیکھتی رہیں۔ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر چپکیں۔ اور اُسے اُٹھا کر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ خانم گو اس وقت خاموش تھیں۔ انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اِن کا قلبی اضطراب پوشیدہ نہ تھا اور میں سمجھ سکتا تھا کہ ان کے صبر و شکیب کی دھجیاں اُڑ جائیں گی۔ ممکن ہے آہوں کے جھٹکے کے ساتھ تارِ حیات بھی ٹوٹ جائیں۔

افسوس میری طفلانہ سازشوں کا کیسا بھیانک انجام تھا۔ میرے ہی ہاتھوں میرے کلیجہ کے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں روتا مسہری پر

پڑ گیا۔ میں رو رہا تھا مگر میرا ضمیر ہنس رہا تھا۔ میری انسانیت نے بھی میری بے تابیوں کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے ندامت سے تکیوں کے درمیان منہ چھپا لیا۔ واقعی دل کا راز افشا کرنے کے بعد مجھے پشیمانی کے سوا حاصل ہی کیا ہو سکتا تھا۔ میں باقی ماندہ رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور صبح ہوتے ہی باہر کے کمرہ میں آ گیا اور پھر اندر نہیں گیا۔ میری اتنی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ خانم سے صاف کہہ دوں کہ میں نے کس غلطی کی بنا پر یہ آفت اپنے سر مول لی تھی۔ حالانکہ دل خانم ہی کی طرف لگا تھا۔

شام ہوتے ہی اندر سے پیغام آنے شروع ہو گئے۔ "بیگم بلاتی ہیں۔ ابھی۔۔۔ جلدی۔۔۔" حالانکہ مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس واقعہ کے بعد خانم میری صورت دیکھنا پسند کریں گی۔ میرا خانم کے سامنے جانا قطعی غیر فطری تھا۔ میں خانم کے خیال سے کانپ اٹھتا تھا۔ مگر خانم کا اصرار بڑھتا گیا۔ میں نے بھی سوچا کہ آخر کب تک نظر چراتا رہوں گا اور دل پر قابو کر کے سر جھکائے ہوئے تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ خانم اس وقت باورچی خانہ میں تھیں۔ کمرہ میں پہنچ کر میں نے اچھی طرح سانس بھی نہیں لی تھی کہ خانم کشتی میں ناشتہ لئے آموجود ہوئیں۔ میں یہ دیکھتے ہی دم بخود رہ گیا۔ چاہتا تھا کہ خانم کی طرف سے نظریں ہٹا لوں۔ مگر اس وقت خانم کی صورت اس درجہ غمگین نظر آ رہی تھی کہ میرے دل کی بیقراریاں بڑھ گئیں۔ اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

خانم نے ناشتہ کی کشتی چھوٹی میز پر رکھ دی اور سلمیٰ کی طرح پائی

لے کر ہاتھ دھلانے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے بڑھ کر خانم کے ہاتھ سے پانی
لے لیا اور منہ ہاتھ دھو کر پھر اسی طرح خاموشی سے کرسی پر واپس آ گیا۔ خانم
نے فوراً میرے لیئے چائے تیار کی اور برابر کی کرسی بیٹھتے ہوئے نحیف
آواز میں کہا "بخدا مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ آپ جو چاہیں کریں میں
آپ کی خوشیوں کے راستے میں روڑا بن کر نہیں آنا چاہتی۔ لیکن مجھے یہ صدمہ
مارے ڈالتا ہے کہ میری اور میرے بچوں کی بربادی کے ساتھ میری بہن
بھی تباہ ہو جائے گی۔ اور میری بہن کی بربادی کے ساتھ میرا خاندان تباہ
ہو جائے گا، مٹ جائے گا۔ وہ گھر میں سب کی آنکھوں کی تارہ ہے۔"
میں نے بات کاٹ کر کہا "آخر تمھیں یہ ......"
خانم نے پھر کہنا شروع کر دیا "میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میرا
کبھی یہ مقصد نہ تھا کہ آپ کے دل کو مجروح کروں یا اپنی خوشیوں کے لئے آپ
کی طرف سے بے فکر رہوں۔ حق یہ ہے کہ میں فطرتاً خاموش طبیعت اور لاپروا
سی واقع ہوئی ہوں۔ مگر آپ نے میری فطرت نہ سمجھی اور غلط فہمیوں کی بنا پر
میری طرف سے ملول رہنے لگے۔ مجھے افسوس ہے۔ کاش میں ہی آپ
کی فطرت کو صحیح طور پر سمجھ کر آپ کی پوری دلجوئی کر سکتی۔
یہ کہتے ہوئے خانم کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ مجھ سے اب نہ رہا گیا۔
میں اٹھ کر خانم کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گیا۔ اور اس کی دلداری کے خیال
سے اپنی اس سکیم کا ذکر کرنے لگا جو ہماری موجودہ پریشانیوں کی باعث
تھی۔ خانم خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھیں کہ احمد نے ایک لفافہ

لا کر دیا۔ میں نے اُسے چاک کر کے پڑھنا شروع کیا۔ یہ سلمیٰ کا خط تھا۔ لکھا تھا۔ دولہا بھائی! میں اسٹیشن پر ہوں۔ اور آپ کی اور باجی کی نظر بچا کر جا رہی ہوں چوروں کی طرح۔ مگر میرا دل خوش ہے ضمیر ہنس رہا ہے کیونکہ میں خدا کے روبرو سرخرو ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری اسکیم اس وقت آپ لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو گی۔ آپ لوگ میری بیہودگیوں پر دانت پیستے ہوں گے مجھے کوستے ہوں گے۔ لیکن کل یہ دیکھ کر آپ لوگوں کو اپنے خیالات بدلنے ہوں گے کہ چند دنوں کی اُلجھن اور پریشانیوں نے آپ کے لئے دائمی مسرت کے سامان مہیا کر دیئے۔ آپ باجی کی محبت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ خدا کا شکر ہے وہ آپ کو مل گئی اور باجی آپ کے قریب ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولئے گا کہ اگر میں اس رات خواب میں چل کر آپ کے کمرے میں نہ پہنچ جاتی تو آج آپ کو کامیابی کی صورت نظر نہ آتی اور باجی کی طبیعت میں صحیح انقلاب ہرگز نہ پیدا ہوتا۔ کاش آپ لوگ میری ان حرکتوں کو معاف کر دیں جو بد اخلاقی سے تعبیر ہوتی رہی ہیں"

سلمیٰ کے خط نے میری اور خانم کی مردہ روحوں میں جان ڈال دی۔ میں نے کہا "اُف! شوخی و شرارت کے ساتھ ذہین اور سمجھدار بھی کس غضب کی ہے ماشاءاللہ۔ اس نے ہماری پژمردہ زندگیوں میں نکھار پیدا کر دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح شبنم کے قطرے پھولوں کی مرجھائی ہوئی کلیوں میں نکھار پیدا کرتے ہیں"

... آپ نے آج سے شبنم ہی کہا کیجئے"

میں نے کہا "ضرور"

خانم بولیں "لیکن ہاں دیکھئے تو اگر گاڑی اسٹیشن سے نہ روانہ ہوئی ہو اُسے واپس لے آئیے۔ وہ رنجیدہ ہوگی۔ اُسے اِس طرح ہرگز نہ دینا چاہئے میں سمجھتی تھی کہ وہ ندامت سے مُنہ چھپائے کمرہ میں پڑی ہے۔ اُف! اُس نے بڑی غلطی کی اور کمبخت احمد نے بھی ہمیں اس کے جانے کی اطلاع نہ کی"

میں نے کہا "گھبرائیے نہیں۔ میں واپس لے آتا ہوں" اور اسٹیشن جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

یکایک سلمٰی ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور یہ کہتی ہوئی خانم سے لپٹ گئی "تکلیف نہ کیجئے۔ آج گاڑی دہلی نہیں جا رہی ہے اور میں واپس [illegible]

[illegible]

خانم نے فرطِ خوشی میں اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اُسے سینہ سے لگا لیا۔ میں حیرت سے سلمٰی کے چہرے پر نظر جمائے تھا۔ اُس کی شوخیاں اب بھی آنکھوں میں رقصاں تھیں۔

حسین خواب کی بھیانک تعبیر

ناصر کی حال میں شادی ہوئی تھی۔ میاں بیوی دونوں جذبات کے نشہ میں چور تھے دونوں کے لئے دن عید رات شبِ برات تھی۔

ناصر نو بجے سے پہلے اپنے کمرہ سے نہ نکلتا اور سرِ شام ہی پھر اندر چلا جاتا۔ اسے گویا مکان کی چار دیواری کے اندر زندگی کا کیف حاصل تھا۔ مکان کے باہر اسے ایک لمحہ بھی چین نہ آتا تھا۔ جب دیکھو ڈیوڑھی میں کھڑا پکار رہا ہے "کلو کی ماں، ذرا، میرا کوٹ کمرے میں ٹانگ دینا"

بھابی جان اندر سے کہتیں۔ "تم خود چلے آؤ نا کلو کی ماں کا ہاتھ خالی نہیں ہے۔ وہ کام کر رہی ہے"

ناصر گردن جھکائے اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ عورتیں اسے دیکھ کر مسکرا دیتیں۔

کمرے میں پہنچ کر ناصر پیار و محبت کی باتوں کا لا متناہی سلسلہ چھیڑ دیتا۔ مگر شرم و حیا کی پتلی صفیہ گھبرا جاتی اور دھیمی آواز میں کہتی۔ "ہٹئے بھی۔ آپ نے تو مجھے کھلونا بنا لیا ہے۔ باتوں کا سلسلہ ہی نہیں ختم ہوتا۔ چولھے پر ہانڈی چڑھی ہے، دودھ ابلتا ہوگا۔ اور کتنے ہی کام پڑے ہیں۔ پھر بھابی جان کیا کہتی ہوں گی"

اس پر ناصر باہر چلا جاتا۔ لیکن ذرا دیر میں پھر ڈیوڑھی میں آواز لگنی شروع ہوتی "ننھے! ذرا اندر سے پان تو بنوا لانا"

بھابی پھر جواباً کہہ دیتیں "تم خود چلے آؤ نا۔ ننھے گھر میں نہیں ہے" اور ناصر مسکراتا ہوا کمرے میں چلا جاتا ہے۔

صفیہ باورچی خانہ میں مشغول رہتی۔ بھابی کہتیں "دلہن جاؤ ذرا پان بنا دو" اور صفیہ ڈوپٹہ سنبھال کر شرمائی لجائی سی اٹھتی۔ دونوں کی نظریں چار ہوتیں۔ بھاوج ہنس دیتیں۔ اور صفیہ شرما جاتی۔

کمرے میں پہنچکر صفیہ کو اس مرتبہ کوئی نیا تحفہ ملتا۔ ناصر روز اسی اسی طرح اس کے لئے کچھ نہ کچھ چھپا کر لاتا تھا۔ عورتیں دیکھتی تھیں اور خوش ہوتی تھیں۔

دوسرے سال کے اختتام پر ہزاروں منت و مراد کے بعد صفیہ کے لڑکی پیدا ہوئی۔ نہایت ہی بھولی اور خوبصورت سارے گھر نے خوشی منائی۔ لیکن اتنی نہیں جتنی کہ لڑکے کی پیدائش پر ہوتی تھی۔ ناصر بھی زیادہ مسرور نہ تھا۔

دو سال کے بعد صفیہ کے دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ عورتوں نے رسماً کچھ خوشیاں منائیں۔ مردوں کے قطعی اظہار مسرت نہ کیا۔ شاید انھیں یہ اضافہ پسند نہ تھا۔ صفیہ کے ساتھ ناصر کی دلچسپیوں میں کچھ کسی قدر کمی ہوگئی۔ لیکن ایسی نہیں کہ صفیہ اُسے محسوس کر سکتی۔ لیکن نند بھاوج کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ ضرور بے چین ہو جاتی۔ اور اکثر سوچنے لگتی کہ شاید لڑکیوں کی پیدائش نے سب کے دل اُس کی طرف سے پھیر دیئے ہیں۔ لیکن یہ اس غریب کے بس کی بات نہ تھی۔ قسمت میں لڑکیاں تھیں، پھر لڑکے کس طرح پیدا کر سکتی۔

شادی کا چھٹا سال شروع ہوتے ہی بیچاری صفیہ کی پریشانیوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہ اسی غم میں گھلی جاتی تھی کہ اگر اس مرتبہ پھر لڑکی پیدا ہوئی تو گھر میں سب کی نظروں سے گر جائے گی۔ لیکن قدرت ان باتوں کی پروا نہیں کرتی مصلحت خداوندی اپنی جگہ پر اٹل رہتی ہے۔ اس مرتبہ پھر صفیہ کے لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکی کا نام سنتے ہی سب چھوٹے بڑوں کے چہروں پر المناک اداسی چھا گئی۔ ناصر کی طبیعت میں نمایاں تغیر پیدا ہوگیا۔ اب وہ تمام دن یار دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح میں گھومتا رہتا اور صفیہ کا خیال بھی دل میں نہ لاتا۔ رات کا بھی زیادہ حصہ باہر دیوان خانے میں گذار دیتا۔ اس کا دل صفیہ کی طرف سے بالکل سرد ہو گیا تھا۔

افسوس! تیسری لڑکی کی پیدائش نے [illegible]

لئے مصیبتوں کا دروازہ کھول دیا۔ بد نصیب شوہر کی نظروں سے گر کر
ساس نندوں کی جوتیوں کی خاک ہو گئی سب نے اُسے طرح طرح سے
ستانا اور تنگ کرنا شروع کر دیا۔ بات بات پر طعنے تشنے، بُرا بھلا۔
غرض جو جس کے منہ میں آتا کہتا اور اکثر نندیں ایسا پریشان کرتیں کہ
غریب گھبرا کر رونے لگتی۔ مگر آفرین ہے اُس کی طبیعت پر کہ کبھی کسی
کے سامنے حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔ حالانکہ چاہتی تو والدین
کے یہاں عیش کی زندگی گزار سکتی تھی۔

دن گذرتے گئے۔ دُنیا میں انواع و اقسام کے انقلابات ہوئے
ہوئے۔ مگر صفیہ کا نصیب مگر کبھی نہ بنا۔ اس کی زندگی کی غمناک تاریکیوں
میں سکون کی ہلکی سی شعاع کبھی نظر نہ آئی۔ غریب بدستور مجروح دل پہ
غم و فکر کی چوٹیں سہہ رہی تھی اور خاموش تھی۔

ناصر نے مہینوں سے گھر میں آنا بند کر دیا تھا اور آتا بھی کیسے۔
الماس کے فریب محبت نے اُسے دُنیا سے بے خبر کر دیا تھا۔ وہ دن و
رات اسی کے خیال میں کھویا رہتا۔ مگر صفیہ گرچہ کبھی اُس کی طرف
سے بے فکر نہ ہو سکی۔ جاڑے کی اندھیری اور خوفناک راتیں وہ ناصر
کے انتظار میں جاگ کر گذار دیتی۔ دن کو بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازہ
کی طرف دیکھتی [illegible] پھر نظر ہٹا لیتی اور سرد آہوں کے ساتھ
آنسو بہانے لگتی۔ غرض وہ اپنی عزیز ناصر کے فراق میں اپنی جان
[illegible]

سے بیزار تھا۔

ایک دن صفیہ کو بہت تیز بخار تھا، وہ بے ہوش سی پڑی تھی۔ باہر مردانے میں کئی بار اطلاع کی گئی، مگر ناصر نے کوئی توجہ نہ کی۔ اُس کے لئے صفیہ کی بیماری معمولی بات تھی، وہ جانتا تھا کہ دائمی مریض ہے ہفتوں بیمار رہتی ہے اور خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ دوسرے دن جب بخار ذرا کم ہوا تو کلّو کی ماں نے کہا: "بہو تمھیں یقین نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ناصر میاں الماس کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہیں اور میرے خیال میں الماس نے ضرور ان پر جادو کر دیا ہے۔ ورنہ وہ تم سے اتنا بیزار نہ ہوتے۔ کہ بیماری میں بھی غیروں کی طرح ایک نظر نہ دیکھتے۔"

اِس پر صفیہ سوچنے لگی: "کلّو کی ماں ٹھیک کہتی ہے کہ ضرور وہ الماس کے فریب میں آ گئے ہیں۔ اور اُس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے بھی کچھ کرنا چاہیئے۔ دعا تعویذ میں بہت اثر ہوتا ہے۔ لیکن ذرا دیر میں اس کے خیالات پھر پلٹا کھا گئے نہیں، مجھے اُن کے معاملات میں دخل دینے کی گنجائش نہیں۔ وہ اپنے عیش و آرام کے لئے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ الماس خوبصورت ہے۔ نوجوان ہے۔ اور ہر مرد کا دل اپنی طرف کھینچ سکتی ہے۔ وہ بھی اُس کے دیوانے ہیں، مجھے اُس کے مقابلہ میں کیوں چاہنے لگے۔ میں نہ اُس کی طرح حسین ہوں اور نہ جوان۔ میرے کئی کئی بچے ہیں۔ وہ بھی سب لڑکیاں پھر میں کیوں

حوصلہ کروں کہ وہ المناس سے دل بہلانے کے بجائے میرے پاس بیٹھ کر
اپنا وقت خراب کریں نہیں، نہیں، میں ہر حال میں صبر و شکر کروں
گی۔ اور اُن سے کچھ نہ کہوں گی۔ وہ میرے سرتاج ہیں۔ ان کے
خیالات کی مخالفت کرنا، یا اُن کی خوشیوں میں رخنہ ڈالنا میرے لئے
گناہ ہے۔ انشا جی نصیب کر سے ساتھی بیان ہوا ہے کہا کرتی تھیں۔
کہ نافرمان بیویاں ہرگز نہ بخشی جائیں گی۔ جو بیویاں شوہروں کی غیبت
اور برائی کرتی ہیں اور اُن کو برا بھلا کہتی ہیں۔ اُن کا دین اور ایمان خراب
ہوتا ہے۔ اُن کی قبروں سے مرنے کے بعد دھواں نکلتا ہے۔
گرمی کا موسم شروع تھا۔ صفیہ کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی
وقت نہ بخار کم ہوتا تھا اور نہ کھانسی چین لینے دیتی تھی۔ علاج بھی بہت
معقول نہیں ہو رہا تھا۔
شام کا وقت تھا۔ صفیہ پر شدت تکلیف سے پے در پے بیہوشی
کے دورے پڑ رہے تھے۔ عورتیں سخت پریشان تھیں۔ طاہر کو بھی
اطلاع کی گئی۔ اور اندر آنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ آیا۔ صفیہ نے گرم گرم
آنسوؤں کے قطروں کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کیا۔ اور بیمار پاس نظریں
اُس پر جما دیں۔ ناصر اس المناک منظر کی تاب نہ لاسکا۔ اُس کا دل
بھر آیا۔ اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ صفیہ کے سرہانے بیٹھ
گیا۔ صفیہ نے اپنی کمزور آنکھیں اُس کی طرف اُٹھا کر نحیف آواز میں
کہا۔ "میرا آخری دم ہے۔ آپ آ گئے۔ بڑا احسان ہوا۔ اب بس

پُرسکون موت مر سکوں گی لیکن کاش آپ میری اُن غلطیوں اور کمزوریوں کو
بھی معاف کر دیں۔ جو آپ کی تکلیف کی باعث ہوئی ہیں تو مجھے قبر و دوزخ
کے عذاب سے بچنے کا سہارا ہو جائے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ حالانکہ
میں آپ کی کنیز تھی اور آپ کی اطاعت و فرماں برداری میرا فرض
تھا۔ لیکن میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکی۔ آپ مجھ سے خوش
نہ رہ سکے۔"

اتنا کہہ کر صفیہ خاموش ہو گئی۔ اُس کا دل ڈوب رہا تھا اور اس
کے چھوٹے حلق سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ ناصر اُس کی یہ حالت
دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔
اُس نے کہا: "صفیہ میں خود تمہارا گنہگار ہوں اور تم سے اُن مظالم
کے لئے معافی چاہتا ہوں جو میں نے تم پر روا رکھے۔"

صفیہ نے پھر بولنے کی کوشش کی۔ "خدا کے لئے مجھے شرمندہ نہ
کیجئے۔ میں آپ کی کنیز ہوں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت کا حق نہیں۔"

ناصر نے گلوگیر آواز میں کہا: "صفیہ! روزِ حساب تمہاری نیکیاں صرف
تمہیں بخشا سکتی ہیں، مجھے نہیں۔ میں نے تم پر ضرور ظلم کئے ہیں اور میں
گنہگار ہوں۔ کاش امی میری مرضی کے خلاف مجھے شادی کے لئے
مجبور نہ کرتیں۔ صفیہ یقین کرو۔ لوگوں کی ازدواجی زندگی کی تلخیاں
دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھتا تھا۔ اور اسی لئے میں نے ارادہ کر لیا تھا
کہ زندگی بھر شادی نہ کروں گا۔ اور آزادی کے ساتھ یار دوستوں میں

تفریح کی زندگی گزاردوں گا۔ مگر امی بضد ہو گئیں۔ بولیں کے شادی ہو جانے کے بعد ہر کسی کی زندگی تلخ نہیں ہو جاتی۔ اور نہ کوئی شادی کے بعد دوست واحباب کی صحبتوں سے محروم رہتا ہے۔ میرے خیال میں امی کو اس بات کا زیادہ خیال تھا کہ اگر میں نے شادی نہ کی تو خاندان کا نام کیسے چلے گا۔ جائیداد کا حق کون سنبھالے گا۔ کسی حد تک امی کا خیال درست تھا۔ شادی کے بعد میری زندگی امید سے زیادہ خوشگوار ہو گئی۔ میں تمہاری محبت میں دنیا سے کھو گیا۔ لیکن افسوس لڑکیوں کی پیدائش نے تمام اعزا و اقربا کے دل توڑ دیئے۔ اور بد قسمتی سے میں نے بھی عورتوں کی متواتر چھیڑ چھاڑ سے اپنے دل پہ ضرورت سے زیادہ اثر لے لیا۔ عورتوں کا اصرار تھا کہ میں دوسری شادی کر لوں، لیکن میں نے مناسب نہ سمجھا لیکن افسوس دوسری طرف نہایت آسانی سے میں الماس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ ایسا کہ پھر مجھے تمہارا خیال تک نہ ہوا۔ صفیہ کاش تم میرے قصور کو قصور سمجھتے ہوئے معاف کر دو۔"

صفیہ نے متاثر ہو کر کہا۔ "میری انتہائی بد نصیبی ہے کہ آخر دم آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہی ہوں۔ خدا کے لئے گذری ہوئی راہ کا دھیان چھوڑ کر سامنے منزل کی طرف نظر کیجیئے۔ آپ کے ساتھ بچے ہیں اور ان کی ذمہ داریاں بھی۔"

دفعتاً صفیہ کی آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ گئی۔ عورتیں

بھی جو ادگر دکھڑی یا بیٹھی تھیں۔ رو پڑیں۔ ناصر کے دل پر تو گویا غم کی برچھیاں لگ رہی تھیں۔ افسوس! اُسے ہوش کب ہوا جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

صفیہ نے پھر کہا۔ "مجھے یہ دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے مجھے اپنے دل میں پھر جگہ دے دی۔ مگر افسوس میرے پاس وقت نہیں ہے کہ آپ کے جذبات کی دل میں قدر کر سکتی۔"

ناصر نے محبت سے صفیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "گھبراؤ نہیں تم جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ میں نے شہر کے کل بڑے ڈاکٹروں کو تمھارے علاج کے لئے بلایا ہے۔ اب وہ آتے ہی ہوں گے۔"

صفیہ مسکرا دی۔ یاس و حسرت کے ساتھ، اُسے یقین تھا کہ اُس کا وقت آخیر ہے اور موت سرہانے کھڑی گھڑیاں گن رہی ہیں۔

اتنے میں شہر کے مشہور ڈاکٹر ایک ساتھ اندر داخل ہوئے اور سب نے باری باری صفیہ کا معائنہ کیا۔ واقعی صفیہ علاج کے دور سے گذر چکی تھی۔ سب ڈاکٹر نے بالاتفاق مایوسی ظاہر کی اور علاج کے لئے تیار نہ ہوئے۔

دوسرے دن صبح صفیہ زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی اُس نے آہستہ سے ناصر سے کہا۔ "بچے آپ کے سہارے چھوڑتی ہوں یہ میری نشانی ہیں۔"

ناصر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اطمینان رکھو۔ یہ میر زندگی ہیں۔ اب میں ان ہی کے سہارے جی سکوں گا۔"

صفیہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ اُس میں اب بولنے کی تاب نہ تھی۔ "ناصر رومال سے آنسو خشک کرتے ہوئے صفیہ کے بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرنے لگا صفیہ کی سانس جھٹکے کے ساتھ چل رہی تھی نبضیں بھی ڈوب رہی تھیں۔ اُس نے ایک بار پھر بولنے کی کوشش کی مگر صاف نہ بول سکی۔ جو لوگ قریب کھڑے یا بیٹھے تھے اُنھوں نے سُنا۔ وہ کہہ رہی تھی "سرتاج۔ معاف کرنا۔ الوداع ۔۔۔"

یکایک غریب کی آنکھوں کو جنبش ہوئی اور پلکیں گر گئیں۔ ساتھ ہی سانس کا ایک ایسا جھٹکا آیا کہ اُس کا دم کھنچ گیا اور روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

زرینہ

زرینہ! جس کا یہ نام ہو وہ سوائے خوبصورت ہونے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ میرا ایسا کچھ یقین تھا۔ صرف نام یاد کرنے سے آج بھی ایک آدھ کھلی کلی کی خوشبو اور حسن سنگیت بن کر میرے دماغ میں گونجنے لگتی ہے۔ زرینہ!! پھر مجھے گلے اور رخساروں سے کھیلتے ہوئے اُس کے چمکتے بُندے یاد آئے۔ کانوں اور گالوں کے اوپر سے گزرتا ہوا سفید ساڑی کا مخملی کالا چوڑی دار کنارہ اُس کے چہرہ کے لامحدود خوبصورتی کو محدود کر گئے، اب بھی جب میں سوچتا ہوں، میرے دل و دماغ کی دنیا تنگ بنا دیتا ہے۔ میں نے وہی ایک چہرہ دیکھا جس میں ناک اوپر سے دھری ہوئی چیز نہیں معلوم ہوتی۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا کہ وہ چھوٹی سی ناک اُس کے حُسن کا نازک تر حصّہ ہے۔ اور اس میں ننھی سی شربتی رنگ کی کیل! اب بھی جب سوچتا ہوں تو شیشے کا ٹکڑا میری آنکھوں میں جیسے چبھتا ہے۔ لب ایسے ملے ہوئے تھے جیسے آپس میں خاموش باتیں کر رہے ہوں۔ ان ہونٹوں کو میں نے کبھی بناوٹی رنگ کا محتاج نہیں پایا۔ گھورے مکھڑے پر سیاہ چنچل آنکھوں کا رقص میری

میری سوتی جاگتی آتما کو ایک ابدی تمنا تنائی بنا رکھا تھا۔ زرینہ !!!
ہمیشہ اس لفظ سے کسی کی پتلی کمر یاد آتی ہے۔ اور پھر وہ کمر جس پہ اس کی
غیر محسوس جوانی اٹھکھیلیاں کرتی چلتی تھی۔ اس کی لمبی سڈول باہوں
کو دیکھ کر میرے خود غرض دل نے کتنی بار نہیں چاہا کہ بیل کی طرح وہ مجھ
سے لپٹ جائیں۔ زرینہ !!!! اس لفظ سے مجھے ہمیشہ کسی ادھورے
افسانے یا ادھورے شعر کا خیال آتا ہے۔

لیکن تھی وہ طوائف، میں اُسے طوائف ہی کہوں گا کیوں کہ اس لفظ
میں شاہی شان کی جھلک ملتی ہے۔ قالین کا فرش، مسند، پاندان اور
اُگالدان۔ ولیشیا، اُسے نہیں کہہ سکتا کیونکہ ولیشیا کہتے وقت ایسا محسوس
کرتا ہوں۔ جیسے میں اس کے ساتھ بے انصافی کر رہا ہوں۔ اس لفظ
میں جو زہر ہے، جو آلودگی، جو بدصورتی اور جو مفلسی ہے وہ زرینہ میں نہیں
تھی۔ زرینہ ویل چھاپ کی کالی سلیپر پہنتی تھی وہ ولیشیاؤں کی طرح چپلیں نہیں
پہنتی تھی۔ چپلوں کا خیال کر کے گاندھی جی کی یاد آتی ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے
جیسے ولیشیائیں اس ملک کی غربت کو پیروں میں پہن کر چل دی ہیں —
کالی سلیپر کے ساتھ چلی ہوئی وکالت کا خیال آتا ہے۔ زرینہ سر سے
پاؤں تک سادگی و خوبصورتی کا مجسمہ تھی۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی
جسے کوئی بھی پڑھ سکتا تھا۔ زرینہ بکتی تھی، اپنے کو بیچتی نہیں تھی۔ ولیشیا
کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے، نفرت ہوتی ہے۔ زرینہ کو دیکھ کر عزت کرنے کی خواہش
ہوتی اور محبت بڑھتی تھی۔ آخر وہ تھی کیا سلجھی ہوئی پہیلی جس میں کوئی بھی

کس آسانی سے اُلجھ سکتا تھا۔

میری اُس کی جب ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے کچھ ہی کم عمر کی رہی ہو گی۔ میں بھی زندگی سے انجان تھا۔ یوں بھی طالب علمی کی زندگی میں کسی کو اتنی فرصت کہاں کہ دنیا کے غیر معمولی مسرت کا حصہ دار ہو سکے۔ لکھنے پڑھنے کے زمانہ میں جب کبھی ہلکے قسم کے جذبات اور خواہشات سر اُٹھاتے ہیں تو اُنھیں تھوڑی دیر کے لیے خیالوں اور خوابوں کی پھوار سے سینچ کر پھر سلا دینا پڑتا ہے۔ وہ ایسی عمر ہوتی ہے جب کہ خاص طور سے کچھ کرنے کو نہ ہوتے ہوئے بھی ہم ضرورت سے زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ حالاں کہ دنیا اس وقت تک کھیلنے کے لیے کوئی خاص کھلونے ہمیں نہیں دیتی جس کے ساتھ ہم مصروف ہو کر کھیلیں، پھر بھی ہم بچپن کے کھیلوں میں ایسے مصروف رہتے ہیں کہ دیر تک کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں دے سکتے۔

آغازِ شباب چیزوں کے سمجھنے کا وقت ہوتا ہے۔ ہر شخص، جو مجھ سے ایک دن بھی پہلے دُنیا میں آیا ہو، مجھے راستہ بتانے کا حق دار ہو جاتا ہے۔ ہر طرف سے ہم پر نصیحتوں کی بارش ہونے لگتی ہے ایسی کہ اگر یہ سب نصیحتوں کو مان لے تو بوڑھا ہو جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ہر چیز کو اُسی طرح نہیں مان لیتے جیسے ہمیں بتایا جاتا ہے۔ بہر حال دنیا میں آنکھ کھولتے ہی ہر شخص ہمارے سامنے ہمہ دان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دنیا کو ہم ایک عجائب خانہ کی شکل میں پاتے ہیں۔ ہماری پہچان کے لیے ہر چیز پہ کوئی نہ کوئی "لیبل" لگی ہوتی ہے اِس سے مطلب نہیں کہ عام طور سے کٹھل کی "لیبل" املی پر ہو۔

کی آمد پر ہوتی ہے۔ دنیا ہمیں نصیحتوں کی خوردبین دیتی ہے جس کی مدد سے ہم چیزوں کو دیکھ سکیں۔ ہر شخص میرے لئے زندگی کے راستہ پر خطروں سے آگاہ کرنے والا رہنما ستون بن جاتا۔ اس چیز کو مت چھوؤ، اُس سے مت بولو۔ اُس سے مت اُلجھو، اُس سے مت ملو، وغیرہ وغیرہ ...... نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا ہماری نگاہوں کے سامنے خرابیوں اور برائیوں کا ایک ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے۔ راستے کم ملتے ہیں اور رکاوٹیں زیادہ۔ ان روڑوں اور رکاوٹوں کے سامنے ہمیں سر جھکانا پڑتا ہے۔

غرض کہ اس طرح جوانی کی صبح کو جب میں نے دیکھا تو ہر چیز راستہ روکے کھڑی تھی۔ مگر میرے اندر ایک طاقت تھی جو مجھے آگے بڑھائے جاتی تھی۔ میں خود کو روکنے لگا۔ ایک زبردست کشمکش ہوئی۔ زندگی جسے ایک بہتے ہوئے چشمے کی طرح سادہ اور سہل سمجھے تھا۔ وہ میرے واسطے ہر قدم پر بند صن ثابت ہونے لگی۔ لیکن آخر میں اُس اندرونی طاقت سے مغلوب ہو گیا اور ساری رکاوٹوں اور بندھنوں کو توڑتا اڑ کر آگے نکل گیا۔

اُس سے پہلے میں نے 'شرون کمار' اور 'سُور داس' جیسے ڈرامے دیکھے تھے۔ اور اسٹیج پر رنگ برنگ کے پردوں کے سامنے مختلف قسم کے مناظر قدرت کے درمیان سنہری تتلیوں جیسی پریوں کو ناچتے تھرکتے بھی دیکھا تھا اور اپنی عمر کے لحاظ سے ان سے لطف اندوز بھی ہوا تھا کبھی کبھی اسکول سے لوٹتے وقت تھیٹر کے شامیانے کے باہر کھڑا ہو کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ انگریزی بینڈ سن کر اپنا جی بہلا لیا کرتا۔ لیکن آج ناٹک دیکھتے وقت کچھ اور ہی قسم کا احساس ہو رہا تھا۔ اسٹیج پر خوبصورت ہیروئن کو عشق کے طوفان میں گھر کر جو کچھ سہنا اور بھگتنا پڑ رہا تھا اُس میں مجھے اس سے

ہمدردی تھی۔ ہمدردی ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی میرا دل ایسا بدست ہوتا کہ جی چاہتا کہ ہیروئن کی دکھ درد کی کہانی ایک دم ختم کرنے کے لئے خود اپنے کو نثار کردوں اور اس طرح ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کی تمام مشکلات ختم ہوجائیں

میں جس درجہ میں بیٹھا تھا اُسی قطار میں دو بہنیں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ناٹک دیکھ رہی تھیں۔ دیکھنے میں بنگالی معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی بہن عورت زیادہ تھی، اور لڑکی کم، جس کی وجہ سے وہ میری جوانی کے سپنوں کے نزدیک آبھی کیوں سکتی تھی لیکن اس کے اور اُس کے ماں کے درمیان وہ پندرہ سولہ سال کی لڑکی تھی جسے دیکھتے ہی مجھ میں جیسے سنسنی دوڑ گئی۔ اُسے ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنے کی پیاس بجھتی ہی نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ اُس حال میں میرے واسطے دو ناٹک ہونے لگے۔ ایک اسٹیج پر اور دوسرا اس لڑکی کے ارد گرد۔ اُسے دیکھ کر میرے دماغ میں بہت سے سوال اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُس کو جاننے اور سمجھنے کے لئے میرے قلب کا ایک ایک تار بے چین ہوگیا۔ اس چھوٹے شہر میں کس بنگالی گھرانے کی ہو سکتی ہے؟ میرے لئے وہ اتنی بیش قیمت ہوگئی تھی کہ میری نظر میں اُس شہر میں کوئی ایسا خوش قسمت ہو ہی نہیں سکتا تھا جس کی وہ ہوسکتی!

معلوم نہیں شہد کی مکھی پہلے پھول پر بیٹھتی ہے یا کانٹے پر۔ لیکن جب سے میں اس سے دلچسپی لینے لگا تھا۔ میری آنکھیں اس سے زیادہ اُس سے تعلق رکھنے والوں کی جانچ پڑتال میں مصروف ہوگئی تھیں۔ ہر شخص کو شبہہ کی نظر سے دیکھتا۔ اُس تھوڑی سی دیر میں اُس کے سادہ حُسن کی کنج میں میری معصوم محبت نے جو آشیانہ بنا لیا تھا اُس میں غریب پرند کی طرح بیٹھا میں بیاردل طرف نظریں گھما گھما کر

دیکھ رہا تھا کہ حسن اور محبت کے دو تنکوں کے بنے ہوئے آشیانے کے بگاڑنے والے وہاں کون کون تھے۔ جب ڈراپ سین کا پردہ گرتا تو اُس کے آس پاس مجھے دو گنڈے گلاس میں شربت یا ہاتھ میں پان لئے نظر آتے معلوم نہیں وہ گنڈے تھے یا کیا۔ بہر حال میرا دل اس سے واسطہ رکھنے والوں کے بارے میں کچھ اچھا نہیں سوچ سکتا تھا میرے لئے زیادہ پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اس بیچین فضا میں مجھے ہر شخص اسی کی طرف دیکھتا نظر آتا۔ یہاں تک کہ بجلی کا ٹیبل فین "بھی جو اُس کے قطار کے سامنے ہوا دینے کے لئے رکھا ہوا تھا ایسا لگتا جیسا داہنے بائیں گھومتے ہوئے اُس کے سامنے آ کر رُک جانے لگتا اور مجبوراً وہاں سے ہٹتا تھا۔ غرضکہ جس چیز کی طرف میں اپنے سکھ اور شانتی کے لئے کھنچ گیا تھا اس طرح وہ میرے واسطے لامحدود تکلیف اور پریشانی کا سبب بن گئی تھی۔ جسے میں ابھی اچھی طرح دیکھ یا جان بھی نہ سکا تھا وہ یک لخت میری ہو گئی تھی۔ اپنا بنانے کے لئے تو کیا کر سکتا تھا۔ لیکن اُسے دوسروں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے تدبیریں سوچنے میں میری ساری قوت جیسے اندر ہی اندر ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس طرح اُس اتھاہ سمندر میں اُمید اور نا امیدی کے اُٹھتے ہوئے جوار بھاٹے میں میرا دل ڈوبتا اور اُبھرتا رہا۔

ناٹک ختم ہوتے ہی باہر نکلا۔ برآمدے میں کئی سو کینڈل پاور کی بتّی کی روشنی میں اُس کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے۔ اُس آنکھوں سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مجھے غیر ارادی طور پر اپنی طرف بلا رہی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر میں بھی چلنے لگا۔ تھیٹر سے نکل کر سونی سڑک پر چلتا ہوا اپنے چاروں طرف

دیکھتا جاتا۔ جب بجلی کی روشنی کا کھمبا قریب آتا تو ذرا پیچھے رہ جاتا۔ روشنی
میں پہنچ کر وہ میری طرف دیکھتی۔ رات کے دو بجے ہوں گے۔ نا تک نہ دیکھنے
والی شہری دنیا ہو گئی تھی۔ سڑک سونی پڑی تھی۔ سانجھی پان شربت والے
آدمی مجھے جنھیں دیکھ کر کبھی کبھی میرے دل میں ڈر بھی پیدا ہو جاتا۔ یہ ارادہ
کر کے کہ اگلی گلی سے مڑ کر گھر چلا جاؤں گا میں اس کے پیچھے پیچھے چلا
جا رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے اندھیرے راستہ میں روشنی
دکھا رہی ہے۔ اندھیری گلیوں میں پھر جاتا کیسے؟

چلتے چلتے اس محلہ میں پہنچ گیا جہاں دن کے وقت جانے کا خیال بھی نہ
ہو سکتا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے پہنچ کر میں نے اسے پہچانا۔ اب میرے
دل میں مطلق شبہ نہ رہا۔ اسے گھر تک پہنچا کر وہ شہدے ٹوٹ پڑے۔ انھیں
آتے دیکھ کر میری جان نکل گئی۔ طے نہیں کر پایا کس طرف جاؤں۔ پریشانی کی
حالت میں پاؤں پڑتے گئے۔ اندھیری گلی میں چلتا گیا۔ آگے جا کر وہ گلی بند
ملی۔ ڈرتا ہوا الٹے پاؤں لوٹا۔ اس کے مکان کے سامنے اندھیرا تھا۔ لیکن
میں اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔ برآمدہ میں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اندر چلی گئی۔

اب میں اکیلا تھا اور سوائے ان اندھیری گلیوں کے اور کوئی ساتھی
نہ تھا۔ جدھر سے گیا تھا اسی طرف سے لوٹ رہا تھا۔ کبھی ڈر لگتا تو کبھی ڈرنے
پر غصہ آتا تھا۔ اپنی زبوں حالی، بد دماغی، حماقت اور شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔
کہاں چلا آیا؟ مجھے ہو کیا گیا تھا؟ اپنی ذات سے نفرت [illegible] ہو رہی تھی۔ ایسا
محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت بڑا گناہ کر کے لوٹ رہا ہوں۔ [illegible] ذلت

گئے سڑکوں پر صرف بھینسے گاڑیاں چل رہی تھیں۔ ان کے پہیوں کی آواز دور دور سے چیختی ہوئی آتی۔ میں چلتا جاتا۔ دھیرے دھیرے ایسا محسوس کرنے لگا۔ جیسے میں خود میلا گاڑی کی طرح سڑک پہ بوجھل سا چلتا جا رہا ہوں۔ اتنے میں کسی طرف سے ایک کتا دوڑا آیا اور مجھے گھیر گھیر کر بھونکنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے پھٹکار رہا ہے۔ میں اور شرمندہ ہوا۔ کتے سے جان چھوٹی تو گھر کا خیال ستانے لگا۔ معلوم نہیں نوکر نے بچھونا نکالا ہوگا یا نہیں۔ ماں شاید بیٹھی ہوئی انتظار کر رہی ہوں۔ پھر خیال آیا، محلّے کے کسی آدمی نے مجھے دیکھا تو نہیں ..... انھیں خیالوں کی بھیڑ میں ڈرتا کانپتا اور افسوس کرتا گھر پہنچا۔ سب سو گئے تھے۔ دروازہ پر میری چارپائی بچھی تھی۔ کوٹ اتار کر سرہانے رکھا۔ صراحی سے ایک گلاس پانی انڈیل کر پیا۔ چارپائی پہ بیٹھ کر منھ ہاتھ پاؤں دھوئے پھر مسہری گرا کر اپنے دونوں کان پکڑ کر قسم کھائی کہ ایسی بھول کبھی نہ ہوگی اور گایتری منتر پڑھتا پڑھتا سو گیا .... میری غریبی کا خیال مت کرو ورنہ ابھی تمھیں کتنا پیار کرتا ہوں۔“ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا۔ اس نے مسکرا کر اپنی انگلیاں چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟ بات کاٹ کر غمگین آواز میں میں نے کہا۔ ”جانتا ہوں۔ لیکن مجھ سے کیوں کہلانا چاہتی ہو؟ .... تم میری سب کچھ ہو۔“ کہتے کہتے جیسے میرا گلا بھر آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ایک لمحہ مجھے چپ اداس آنکھوں سے دیکھتی رہی ——

”تم مجھے بالکل نہیں جانتے ہو۔ پیسے کے لئے میں [illegible] ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے ناک کی نتھ چھو کر بولی " اسے دیکھتے ہو؟ اس کی قیمت ہے "سو روپئے۔ چھوڑو مجھے جانا ہے "۔ اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کے نیچے سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں گھٹنوں کے بل زمین پر اُس کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر حسرت بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا " میں دوں گا.... سب کچھ دوں گا......... میں سو ہزار دوں گا........" یہ کہتے کہتے میری زبان لڑکھڑائی۔ اُس کے چکنے چکنے پاؤں میرے ہاتھوں میں آ گئے تھے وہ مسکرانے لگی۔ اپنے پاؤں چھڑا کر کھمبے کے پاس کے پل کی پتھریلی دیوار پر بیٹھ گئی۔ مجھے بھی اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر چپ بیٹھی رہی پھر کچھ سوچتی ہوئی بولی ـــ " تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے بتایا ـــ " میں پڑھتا ہوں "۔ سوال ٹھیک سے نہ سمجھنے پر اُس نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگی۔

اتنے میں ایک کتا سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے میں نے زور سے لات مار کر بھگا دیا۔ پھر میں نے اُس کی کمر میں بایاں ہاتھ ڈال دیا۔ اُس کا داہنا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پاگل کی طرح بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کمر زیادہ پتلی ہے یا ہاتھ زیادہ ملائم ہیں......... ایک یکہ والا کوئی غزل گاتا ہوا یکہ تیز دوڑاتا گزرا۔ ہمیں دیکھ کر قہقہا مار کر ہنس پڑا۔ وہ مسرور ہو کر میٹھے راگ میں گنگنانے لگی ؎

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے   بج رہا ہے اور بے آواز ہے

پھر اُس نے میرے گالوں کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپا کر پیار سے چوم لیا۔ ہونٹ سے ہونٹ ملے تھے کہ میری آنکھیں بند ہو گئیں معلوم نہیں ہم دونوں کب تک اِس عالم میں خاموش بیٹھے رہے جب اُسے نیند آنے لگی تو اپنی گود میں اُٹھا کر اُسے پُل کی دیوار پر زمین پر سُلادیا۔

زور سے مُرغ نے سرہانے بانگ دی۔ آنکھ کھُل گئی۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں! مچھر دانی سے مُنہ نکالتے ہی دیکھا۔ ایک لال مُرغا ایک مُرغی کا پیچھا کر رہا ہے۔ ہکا بکا رہ گیا۔ کیا سب خواب تھا۔ سوچنے لگا۔ جلدی سے چارپائی سے اُٹھا۔ سب جاگ گئے تھے۔ نوکر برآمدہ میں جھاڑو دے رہا تھا۔ سرہانے اخبار رکھا تھا۔ اُٹھا کر پڑھنے لگا۔

سوائے بڑھیا ماں کے دنیا میں میرا اور کون تھا۔ پتا جی اپنی کمائی ہوئی دولت چھوڑ کر جوانی ہی میں اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ لئے اس دنیا سے چل بسے تھے۔ میں تنہا اپنی ماں کی آنکھوں کی روشنی۔ ماں کی وجہ سے بچپن میں میں نے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی۔ میری طرف سے ماں کو کبھی دل شکنی نہ ہونے پائی۔ پڑھنے لکھنے میں کبھی بُرا نہیں رہا۔ امتحان میں میرا پاس ہونا ہی ماں کے لئے سب سے بڑی خوشی تھی۔ میری ہر خواہش کو پورا کرنے میں اُنھوں نے کبھی کچھ اُٹھا نہیں رکھا۔ نہ تو میرے اوپر اُنھوں نے کبھی کسی قسم کی بندش یا رکاوٹ عائد کی۔ ہمیشہ اپنی محبت کے سائے میں جس سے مجھے کبھی پھولوں [illegible] چنانچہ [illegible] جو دی

چیز کی کمی نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی میرے لئے پھیکی اور بے معنی ہو کر رہ
گئی تو اس میں کسی کا قصور ہو سکتا تھا۔ پھر بھی وہ دن کتنی پریشانی میں
کٹ رہے تھے۔ پاگلوں سی میری حالت تھی۔ کھانا کھاتے وقت ماں مجھ
سے اور کھانے کا اصرار کرتے کرتے اداس ہو جاتیں۔ میں کسی طرح بھی
انھیں خوش نہیں کر سکتا تھا۔ وجہ شاید یہ بھی تھی کہ خود میں ہی جو اپنی
خوشی کھو بیٹھا تھا۔

شام ہوئی نہیں کہ ندی کی سمت چلا۔ دریا کنارے دیپ تو جی بہلانے جاتا۔
لیکن اس سے بھی زیادہ اس خیال سے کہ لوٹتے وقت اس محلہ کی طرف
سے آنے کا بہانا ہو جاتا تھا۔ عموماً سورج ڈوب جانے کے بعد اس کے
دروازے کے سامنے سے گزرتا تھا۔ مکان کے سامنے ہمیشہ کوئی نہ کوئی
سواری، موٹر یا تانگہ کھڑا رہتا۔۔۔ روشن کمرے میں محفل جمی ہوتی ہوتی۔
جس کے بیچ میں وہ حسن کی دیوی صدارت کرتی رہتی۔ مسند سے لگے
ہوئے دو چار بڑے آدمی نظر آتے۔ پان سگریٹ کا دور چلتا رہتا۔
کبھی گانے بجانے کا دور رہتا۔ کبھی کچھ اور۔ میں نالے کے کنارے
دیوار کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ اتنے میں کسی کے مست قہقہے کی آواز
آتی اور میں وہاں سے بےچین ہو کر چل پڑتا۔ وہ مجھے اپنی خاموش
نگاہوں سے اس طرف آتے جاتے دیکھا کرتی۔ مجھے اپنے اوپر جھنجھلاہٹ
ہوتی، غصہ آتا اور نفرت بھی ہوتی۔ تہیہ کرتا، قسم کھاتا۔ اب پھر
یہاں نہ آؤں گا۔

لیکن گھر پہونچ کر پھر اُس کی یاد ستانے لگتی۔ میں سوچتا مجھے ضرور چاہتی ہے۔ کنکھیوں سے دیکھتی ہے۔ لیکن اپنی ماں سے مجبور ہے۔ بڑھیا چوکھٹ ہی پر تو پاندان لئے بیٹھی رہتی ہے۔ آخر بیچاری کرے تو کیا کرے۔ لیکن مجھے ضرور چاہتی ہے۔ نہیں چاہتی تو خواب میں کیوں آتی۔ اس کی باہیں اُس کی کمر، انگلیاں، وہ ہونٹ گداز اور ملائم جسم! کس طرح اُس نے مجھے چوم لیا تھا، اور میں طے کر لیتا ——— وہ میری ہے۔ چاہے جو ہو میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اس کے جسم کے ہر حصّے کو کتنے قریب سے میں نے دیکھا ہے، چھوا ہے کیسی پھول سی ہے وہ۔ ان خیالوں سے پاگل ہو جاتا۔ اُسے چھونے کے لئے انگلیاں پھر جیسے رینگنے لگتیں۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ میرے بازو ٹوٹنے لگتے جیسے میرے بدن کے کوئی ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتیں جس کی جلن سے پتلیاں دونوں سوچ کر اتنی بڑی ہو جاتیں کہ پلکیں انھیں ڈھانک نہیں پاتیں۔ بند کمرے میں میری روح چیخ اٹھتی۔ میں اُس کے پاس جاؤں گا ضرور جاؤں گا۔

جیٹھ کی دوپہر تپ رہی تھی۔ لو چل رہی تھی۔ ننگے سر میں اُس کے مکان کے سامنے سے گزرا۔ دروازے بند ملے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن سننے کی کوشش کی تو طبلے اور گانے کی آواز ساتھ آ رہی تھی۔ پھر بےچین ہو کر جلدی جلدی چلنے لگا۔ میرے کندھے پر کسی نے زور سے ہاتھ رکھ دیا۔ میں چونک اٹھا۔ مڑ کر دیکھا۔ روشن لال! اُس نے

تعجب کا اظہار کرتے ہوئے ہنس کر پوچھا "کہئے جناب! آپ یہاں کہاں؟ بڑے چھپے رستم نکلے"! میرے ہوش اڑ گئے گھبراہٹ میں معلوم نہیں کیا جواب دیا۔ ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے چوڑی گلی سے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف اونچے اونچے گھر تھے۔ دھول لئے ہوئے لو زور سے چل رہی تھی۔ اتنے میں روشن لال ایک دم بے تحاشہ بھاگا۔ ہوا کے ساتھ دھول کا بگولا اڑتا دیکھ کر میں بھی اسی طرف بھاگا جتنا تیز بھاگ سکتا تھا بھاگ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کے مکانوں کی دیواروں کو دیکھتا جاتا۔ زمین مکانوں کے لئے ہوئے نیچے اوپر ہو رہی تھی۔ روشن بھاگتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ گلی میں روشن کھڑا زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا "بڑے اُلّو ہو جی! بھاگے کیوں!" روشن لال نے دم لے کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ارے یار بال بال بچے، اُدھر کی گلی سے خسر آ رہے تھے"۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی — "لیکن تم بھاگے کیوں"؟ اس نے ہنسی روکتے ہوئے جواب دیا — "تمہارا دماغ پھر گیا ہے۔ کیا جانتے نہیں کس محلہ میں ہو؟ انھوں نے دیکھ لیا ہوتا تو بڑے جوتے پڑتے۔ چلتے چلتے میں بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے پوچھا تم کیوں بھاگے؟" میں نے جواب دیا۔ "بھئی میں سمجھا زلزلہ آ گیا"۔ روشن تالیاں پیٹ کر اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "تمھیں ہنسی آ رہی ہے یاد نہیں جو زلزلہ میں نہیں بھاگ سکے وہ کس طرح دیواروں کے نیچے پس گئے پھر ہم

دونوں خوب ہنسے۔ وہ میرے زلزلے کے خوف سے ڈر کر بھاگنے پر اور میں اُس کے خسر کو اُس محلّہ میں سوچ کر۔

اچھے یا بُرے راستہ پر چل رہا تھا۔ یہ میں شاید سوچ نہیں سکتا تھا۔ اپنے کو ہزار بار اُس راستہ پر چلنے سے روکا۔ کس کس کا خیال دماغ میں لا کر اپنے کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شرم، نفرت، اور ڈر مجھے چوکنّے سپاہیوں کی طرح ہر دم گھیرے رہتے تھے۔ جس طرف بھی آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے ہر چیز مجھ پر ہنس رہی ہے۔ نفرت کر رہی ہے۔ جو بھی ہنس کر میرا خیر مقدم کرتا اُس پر شبہ ہوتا۔ ہو نہ ہو مجھ پر نفرت کی ہنسی ہنس رہا ہے۔ یہ خیالات ایک عجیب بغاوت اور دشمنی کے طوفان میرے اندر پیدا کر دیتے۔ چنانچہ میں سب سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اُس اندرونی بغاوت کے باوجود ڈر اور خوف کے جذبات پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ لیکن چوں کہ اپنے کو ہمیشہ مجرم سمجھنے کی ذہنی عادت سی ہو گئی تھی، اس لئے کبھی کبھی ڈر اور خطرے کے خیال سے بے وجہ کانپ اُٹھتا۔ آہستہ آہستہ ہر چیز سے نفرت بڑھتی گئی۔ ہر چیز پر غصّہ آتا۔ خیالی دنیا میں کھو جانے پر خلا میں اکثر اپنے ہی کو پاتا ـــــ پوری طاقت لگا کر پھاوڑے سے کسی بڑے ستون یا بھاری دیوار کو توڑ کر گرا رہا ہوں۔ جب بھی سوچنے کی کوشش کرتا تو اپنے کو ایک زبردست باغی اور دہشت انگیز کی شکل میں پاتا۔ غرضکہ اس طرح میری حالت دوسروں کی نظروں میں بگڑتی گئی۔

اور ساتھ ساتھ میری بوڑھی ماں کی حالت اور بھی پریشان کن ہو چلی۔ میری وجہ سے وہ بہت متفکر رہنے لگیں۔ میں جو کسی حالت میں اپنے بھلے کے واسطے اُن کا بُرا نہیں سوچ سکتا تھا۔ آج اپنی وجہ سے اُنھیں اتنا دکھی دیکھ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان کی خوشی کے لئے اپنا سکھ اور اطمینان قربان کر سکتا تھا لیکن زرینہ تو میری زندگی میں سُکھ نہیں بلکہ دُکھ کا پیغام لے کر آئی تھی میں کتنا مجبور تھا؟ اکثر اسے تیاگ دینے کا تہیہ کرتا اور اس سے نجات حاصل کرنے کی قسم کھاتا۔ لیکن میں کیسے تیاگتا اور کیسے نجات پاتا؟ زرینہ میرے واسطے تھی ہی کیا۔ یا اُس کے لئے میں کیا تھا؟ ایسے خیالات سے جب زیادہ پریشان ہوتا تو سوچنے لگتا۔ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پڑ گیا لیکن مکھی کی طرح گڑ میں پھنسا تھا نکلنے کے لئے جتنا زور لگاتا۔ اُتنا ہی پھنستا جاتا۔ کنول کی طرح اُس کا سادہ حُسن، اُس کی پتلی کمر، اُس کی سڈول ملائم باہیں، پتلی نرم اُنگلیاں نگاہوں پر ڈورے ڈالنے لگتیں۔ اُس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھ کر میرے ہونٹوں کو چوم لیا تھا۔ یہ سوچتے ہی پھر اُسے اپنی گود میں محسوس کرتا اور دماغ نیچے اوپر ہونے لگتا۔ کیا وہ خواب تھا؟ زرینہ صرف ایک خواب تھی؟ لیکن کتنا پُر معنی خواب! پوری کوشش کر کے بھی میں خواب کو خواب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ دراصل وہ خواب نہیں دو تھا۔ اور پھر میں سوچنے لگتا۔ مجھے ضرور سوچتی ہو گی، ورنہ میرے خواب میں کیوں آتی۔ یہ سوچتا ہوا اُٹھا اور اُس کے مکان کی طرف اُسی حالت میں چل پڑا۔

اندھیرے میں مکان کے منڈیر کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ بجلی کے پنکھے سے
اُس کے کمرے کی روشنی کانپ رہی تھی۔ اُستاد کے ہاتھوں کے نیچے طبلے گھڑک
رہے تھے۔ جوڑی کی کھن کھن کھن جیسے مجھے موکھ چڑا رہی ہو۔
صرف ایک سارنگی تھی جو میرے دل سے راگ ملا کر رو رہی تھی
اور وہ گا رہی تھی۔

نا برسو نا برسو

نا برسو نا برسو

ساون کے بادرا کارے

میری سوئی ہوئی آتما جاگ اُٹھی، جوڑ جوڑ بھڑکنے لگے۔ سر
اُٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا ــــــ کہیں بادل نہ تھے۔ لیکن اُس
کی آواز میں کتنی التجا ہے۔ اُن سُروں کی التجا سُن کر میگھ دوت مان ہی
نہیں بلکہ موہ بھی جائیں گے، پھر اُس نے ذرا اونچی آواز میں انترا اُٹھایا۔
آتے ہوں گے آج سجن ہمارے

بہ بیتا کے مارے متوالے

جیسے کسی خیال نے ڈنک مارا۔ ایک دم بوکھلا کر سوچنے لگا۔ کیا تخت
پر مسند لگا کر بیٹھے ہوئے موٹے بدمعاش اُس کے ساجن ہیں؟ اور میرے
دل نے کہا ــــــ ہرگز نہیں۔ جی میں آیا۔ ایک دم کمرے میں داخل
ہو کر بدمعاشوں کو پیٹ کر وہاں سے نکال دوں ــــــ میرے قدم بڑھے
برآمدے کے سیڑھی کے پاس پہنچ کر اتنا ہوا ہیں راستہ پر آ گیا۔

لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ وہ میری ہے اور میری ہو کر رہے گی۔
گھر پہنچ کر سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا
رہا۔ نوکر کو تیز آواز سے پانی لانے کو کہا۔ پھر ٹہلنے لگا۔ گلاس میں پانی لیے ماں
کمرے میں داخل ہوئیں۔ پانی دیتے ہوئے کرب انگیز نگاہ سے انھوں
نے میری طرف دیکھا۔ ماں کو دیکھ کر میں ٹھنڈا پڑا۔ انھیں خوش کرنے
کے لئے ہنس کر کہا ——— "ماں، کتنی دنوں سے میں تم سے کچھ
کہنے کو سوچ رہا تھا"۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا "کہو بیٹا!
کہو کیا بات ہے؟ کہوگے نہیں تو معلوم کیسے ہوگا؟" اتنی ڈھارس پاکر
میں بالکل بچہ بن گیا، سر جھکائے ہوئے رو ٹھ کر میں نے کہا "ماں میں
ایک سونے کی گھڑی لوں گا۔ میرے پاس گھڑی نہیں ہے ——"
اچھا بیٹا! اچھا۔ اتنی سی بات تھی تو کہا کیوں نہیں ......" میں نے
دوسری طرف منھ پھیر کر کہا ——— "میں نے ایک گھڑی دیکھی ہے
وہ مجھے پسند ہے۔ گھڑی والا دوسو روپئے مانگتا ہے۔" ماں حیرت
سے تکتی رہ گئیں۔ "——— بیٹا اتنے دام کی گھڑی لے کر کیا کروگے؟ کوئی
ہلکی ———" مجھے چپ دیکھ کر اپنی بات پوری نہ کر سکیں جب
میں کچھ نہ بولا تو انھوں نے اندر جاتے ہوئے کہا " اچھا اس میں
کیا ہے۔ روپئے دیتی ہوں ۔میں نے تمھاری کون سی بات
نہیں رکھی۔" اور وہ نہ معلوم کیا کہتی ہوئی اندر چلی گئیں۔
ہائے رے جوانی دیوانی۔ تو جو نہ کرائے۔ دوسو روپئے نقد

لئے، جیب پر ہاتھ رکھے۔ زرینہ کے مکان کے سامنے گندے نالے کے پل پر جب اندھیرے میں کھڑا تھا ہر آدمی کو دیکھ کر چور اُچکے کا شک ہوتا تھا۔ کوئی جیب نہ کاٹ لے۔ جس کی جوانی خریدنے کے لئے وہاں گیا تھا اُس کا دروازہ آج بند ملا۔ برآمدہ اور دروازہ پر خاموشی کا عالم، اور اُس تاریکی میں سے مایوسی کی لہریں مجھ تک آتیں اور مجھ سے ٹکرا کر لوٹ جاتیں۔ لیکن بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح ہر لہر میرے جسم کے اور زیادہ حصّہ کو ڈبو دیتی۔ دھیرے دھیرے پانی میرے گلے تک پہنچنے لگا۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح میری آتما آخری سہارے کے لئے تڑپنے لگی۔ اتنے میں سامنے کے دروازے کا ایک کواڑ کھلا۔ اور میں اُمید کے خوف سے بھیگے ہوئے آدمی کی طرح کھڑا کانپ رہا تھا۔ وہ برآمدے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر ساکت کھڑی رہنے کے بعد اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اندر جاتے ہوئے مجھے ہاتھ سے اشارہ کر گئی۔ ایک غیر ارادی سکوت میں، جیسے مجرم پھانسی کے تختے کی طرف بڑھتا ہے، میں اُس کا اشارہ پا کر اُس کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کمرہ میں جب داخل ہوا اُس نے دوسرے کیواڑ کی آڑ میں سے ہاتھ بڑھا کر چٹخنی چڑھا دی۔ بڑے کمرہ سے ہو کر بغل کے کمرہ میں گئی اور پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ سامنے کی کرسی پر اُس کا اشارہ پا کر میں بیٹھ گیا۔ اُس کی سنجیدگی نے میری زبان بند کر دی تھی۔ کچھ دیر

خاموش رہنے کے بعد اُسی کے ہونٹ ہلے "آپ روز یہاں کیوں تشریف
لاتے ہیں؟" سوال سنتے ہی میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ اس
قسم کے سوال کے لئے میں تیار نہیں تھا ہچکچاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے
میں نے کہنا چاہا ــــ "میں آپ کو ــــ" میری بات اُس کی پھیکی ہنسی
سے کٹ گئی۔ سر اُٹھا کر سامنے دیوار پر لٹکتی ہوئی تصویر کو دیکھ رہی تھی،
اور میں گھبرایا ہوا اپنے اُس جملے کو سوچ رہا تھا جو خوش قسمتی سے
نہیں کہا جا سکا تھا۔ اُس کی آنکھیں تصویر پر جمی تھیں۔ سر جھکائے
میں آنکھیں چرا کر اُس کے گلے تک کا حصّہ دیکھ رہا تھا۔ اُس سے کہنے
کے لئے کتنے رومانی مسودے اپنے دل میں نہیں لکھ لایا تھا لیکن اُس
وقت زبان کھولے نہ کھلتی تھی آہستہ آہستہ کمرے کی خاموشی میں
گھبرانے لگا۔ یہاں سے نکالا نہ جاؤں۔ آخر اس طرح کب تک میری خاموش
حماقت کو برداشت کرے گی۔ میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ جب کچھ کرتے نہ
بنا تو میں نے جیب سے گٹھری نکال کر اُس کے سامنے رکھ دی۔ جیسے
پریشان ہو کر اُس نے میری طرف دیکھا۔ اور وہ آنکھیں برابر یہی سوال
پوچھ رہی تھیں، آخر یہ کیا ہے؟ میں نے اُس کی ناک کی نتھ کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کی قیمت، دو سو روپئے" یہ کہتے ہوئے
میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا میں کچھ اور نہ کہہ سکا ـــ
مسکراتے ہوئے اُس نے گٹھری کھولی، روپئے دیکھ کر مسکرا کر بولی
"آپ کو نوٹ نہیں ملے؟" میں بے حد شرمندہ ہوا اور اپنی اُس چھوٹی

سمجھ کو کوسنے لگا جس نے زرینہ کو خریدنے کے لئے چاندی کے روپیوں
کو کاغذ کے نوٹوں سے زیادہ کارگر سمجھا تھا۔ زرینہ نے میرے جیب کی
طرف اشارہ کر کے کہا "آپ کے پاس کچھ اور ہے؟" میں نے مجرمانہ
انداز سے جیب میں ہاتھ ڈالے۔ کچھ پیسے تھے وہ بھی نکال کر اُس
کے سامنے رکھ دیئے۔ روپئے اور پیسے سب ہتھیلی میں بند کر کے بچّوں
کی طرح بجانے لگی۔ میں سامنے اُلّو بنا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ پھر اُس نے
ساری مایا میرے جیب میں ڈال دی اور ریشمی رومال جس وہ کائنات
بندھی تھی، جھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ رومال میں اُنگلیاں پھنسا کر
کھیلنے لگی "رومال میرا ہے۔ روپئے اپنی طرف سے آپ کو مٹھائی
کھانے کو دے رہی ہوں"

میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ اور میں ایسا محسوس کر رہا
تھا جیسے ہوا میں کرسی لگائے بیٹھا ہوں ـــــ اب کیا کروں؟ لیکن کچھ تو
کرنا ہی تھا۔ جی میں آیا پوری کہانی شروع سے آخر تک ایک دم کہہ ڈالوں۔
ارادہ کی آمادگی سے صرف ہونٹ ہلے تھے کہ اس کے ہونٹوں کی شوخی
مسکرائی۔ اور اُس کے پُر معنی چہرے پر ہنسی کی ایک لکیر ناچ گئی۔
لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ پھر ایک تصویر کی طرف دیکھنے
لگی۔ میں کبھی اُس کی اوپر اُٹھی آنکھوں کی سفیدی کو دیکھتا تو کبھی تصویروں
کی طرف۔ سامنے والی تصویر میں ہوائی جہاز اُڑ رہا تھا سامنے کی
سیٹ پر زرینہ، پائلٹ کی ٹوپی اور چشمہ لگائے بیٹھی تھی۔

پیچھے کی سیٹ پر ریاستی کپڑے پہنے، جیسے کوئی راجہ صاحب بیٹھے تھے، اور ان کی بغل میں دبلے پتلے سے انگریزی لباس زیب تن کئے کوئی اور صاحب تھے۔

وہ جیسے تصویر سے باتیں کر رہی تھی "۔ راجہ صاحب اور انکم ٹیکس کے افسر۔ انھوں نے پچھلے تین سال میں دس ہزار سے زیادہ خرچ کئے۔ میں اُن کی فیاضی کے ہاتھ بک چکی ہوں۔ انھیں لوگوں نے میری نتھ اُتاری تھی "۔ اُس کی ناک کی نتھ میرے دماغ میں سوالیہ نشان بن گئی "۔ لیکن آپ تو اب بھی "۔ زرینہ نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "۔ اماں کا حکم اور اُن لوگوں کو بھی شاید یہ حسین فریب پسند ہے "۔ کچھ لمحے ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر شاید میری پریشانی کم کرنے کے لئے اُس نے میری اُنگلی پکڑ کر مجھے اپنے بغل میں بٹھالیا۔ اپنے حُسن کا بوجھ ہتھیلی پر رکھے، جانگھ پر جُھکی ہوئی مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے پوچھا "۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" میں اس سوال کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ لیکن جواب حوصلہ سے دیا "۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں "۔ ناک پہ اُنگلی لے جاکر اُس نے ہنس کر کہا "۔ تو آپ بھی اسے اُتارنا چاہتے ہیں؟" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ میرے پاس سے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

میں لاچار بیٹھا کمرے کی ہر چیز غور سے دیکھتا رہا۔ کس قرینے سے ہر چیز اپنی جگہ پر سجی ہوئی تھی۔ کتنا ملائم بچھونا اور کتنا بڑا پلنگ۔

اور پلنگ کے سامنے دو گدے دار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں پھر اس کے بعد تخت تھا جس پر قالین بچھا تھا۔ تخت پر پڑے ہوئے دو مسند آپس میں رائے مشورہ کر رہے تھے۔ قالین پر ایک طرف اگالدان بھی رکھا تھا۔ دروازے پر موتیوں کا جھلملی دار پردہ پڑا تھا۔ اور دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں جس پلنگ پر میں بیٹھا تھا اس میں سرہانے کی طرف ایک آئینہ جڑا تھا۔ ذرا پیچھے کھسک کر آئینے میں اپنا منہ دیکھنا چاہا۔ آئینہ میں چہرہ چوروں جیسا لگا۔ ایک دم آئینے کے سامنے سے اپنا سر ہٹا لیا۔ اس وقت جیسے کوئی میرے کانوں میں گا رہا تھا۔

"مکھڑا کیا دیکھت درپن میں"

زرینہ واپس آئی اور آ کر میرے بغل میں پلنگ پر پہلے کی طرح بیٹھ گئی۔ اس کی طرف جب میں نے دیکھا تو ناک میں نتھ کے بجائے شربتی رنگ کی نگ جڑی ایک کیل تھی۔ زرینہ کا حسن اس کیل کی جڑاؤ میں سے کوئی مدھر راگ الاپ رہا تھا۔ "آپ یہی چاہتے تھے نا" "لیجئے آپ والی ہو گئی" میری طرف دیکھ کر جس وقت اس نے کہا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں پر چھا گئی تھیں۔ میرے ہاتھ اپنی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں میں لے کر سنجیدگی سے بولی۔ "تو آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں!" لیکن میں محبت کے لئے نہیں ہی۔ آپ پڑھنے لکھنے والے بھلے گھر کے لڑکے ٹھہرے۔ آج تو خیر اماں جان نہیں ہیں ——— لیکن آپ میرا کہا مانئیے ——— " میں جیسے ایک عجیب ہیجان میں بول اٹھا۔"

"زرینہ" ناممکن ہے زرینہ مجھ سے نہ ہوگا —" میرے منہ سے لفظ "زرینہ" اُس بیباکی سے سُن کر زرینہ کو بھی مسکرانا پڑا "ناممکن ہے اور اگر میں تم سے محبت کرتی ہوں ؟" میرا سر جھک گیا "اگر آپ اسی سے خوش ہیں تو میں آپ کو پیار کرتی ہوں۔ لیکن میں آپ سے پھر کہوں گی کہ میں محبت کے لئے نہیں —" میری نظریں سیدھی تصویر کے جہاز پر گئیں۔ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی "یہاں ہر چیز فریب ہے۔ جھوٹ ہے۔ ہوائی جہاز کی تصویر میں میری اور میرے چاہنے والوں کی تصویریں اوپر سے شامل کر دی گئی ہیں۔ ان لوگوں نے سب سے زیادہ میری قیمت دی ہے میں ان کی ملازم ہوں۔ تصویر نقلی ہے" باتیں سنتے سنتے جیسے مجھ میں جان آنے لگی۔ ہر چیز میں ایک نیا پن محسوس کرنے لگا۔ اب تک جو ماحول ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا اس کا اثر طبیعت پر یک بیک اتنا خوش گوار ہو گیا کہ مجھے جیسے نشہ ہونے لگا خاموش لہجہ جیسے وہ گویا خود سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے کچھ سنا کچھ نہ سنا اور جو کچھ سنا اُسے سن کر ان سنا کر دیا۔ لیکن اُس کے ہونٹوں کی حرکت سے ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے اُس کے نرم ہونٹ آہنی الفاظ گڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں —

"...... نہ ہونے دوں گی۔ لیکن میری کامیابی بغیر تمہاری مدد کے نہیں ہو سکتی" ایک ٹک دیکھتا اُس کی باتیں سنتا رہا "تم

جانتے ہو تم نے میرے اندر ایک طوفان اُٹھا دیا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے وہ نہ چاہو گے جس کے لئے یہاں لوگ آتے ہیں ہیں۔ اس کے بدلے وعدہ کرتی ہوں تم سے وہ سلوک نہ رکھوں گی جس کے لئے میں دروازہ کھولے بیٹھی ہوں...... تم سے مجھے جو زندگی کی نئی جھلک ملی ہے اُسے امر بنانے میں تم میری مدد کرو گے۔ مجھے امید ہے تم مجھ میں وہی پاؤ گے جس کی تصویر دل میں لے کر یہاں آئے تھے" میرا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ پلنگ پر اُس کے ساتھ لیٹا ہوا میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بادلوں کی سیج پر سمٹے ہوئے ہم دونوں آسمان میں اُڑ رہے ہیں۔ میں شروع سے آخر تک اُسی کو دیکھ رہا تھا اور وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اتنے میں کوئی باہر سے دروازہ پیٹنے لگا۔ مجھے گھبراتے دیکھ کر اُس نے میری ہمت بندھائی آگے آگے وہ چلی اور میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ ڈیوڑھی کی تاریکی میں پہونچ کر کسی کی باہوں نے مجھے گھیر لیا۔ اور پھر جیسے کسی نے میرے ہونٹوں پر گرم ردی کی سیج رکھ دیا ہو۔ جس وقت وہ ہٹ کر سے کا دروازہ کھول رہی تھی۔ اُسی وقت ڈیوڑھی کا ایک پلہ کھول کر میں باہر نکل گیا۔ کوئی صاحب باہر انگریزی کپڑے پہنے، سر پر نائٹ کیپ اس طرح رکھے کہ چہرہ آسانی سے پہچانا نہ جا سکے، پتلون میں سے قمیص کا دامن نکلے ہوئے جلدی جلدی اپنے کو ہوا دے رہے تھے۔ بالوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ باہر نکل گیا۔ انھیں اُس حالت میں دیکھ کر ہنسی آئی۔ لیکن

وہ دن یاد کر کے جب مجھ کو بھی اُس دروازہ پر پسینہ آنے لگا تھا۔ میں چُپ ہو رہا۔

گھر پہنچ کر میں نے اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا۔ روپیوں کو بکس کی تہہ میں رکھا۔ پھر دھیرے سے وہ پانچ روپے کی سونے کی گھڑی نکالی۔ اُس نقلی گھڑی میں مجھے وقت دیکھتے ہوئے ہنسی آ گئی۔ گھڑی لے کر اندر گیا۔ ماں کی ضعیف آنکھیں لالٹین کی روشنی میں "اصلی" سونا دیکھ کر چمکنے لگیں۔ ماں نے کہا: "بیٹا! اب تو تم نے خرید ہی لی۔ اگر کہو تو اسے اپنے پاس رکھ لوں۔ شاید تم سے کھو جائے۔" میں نے اپنی رضامندی کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ کوئی اور نہ جاننے پائے کہ میں نے گھڑی خریدی ہے۔ ماں کو میری بات پسند آئی اور اُن کو خوش دیکھ کر میں اُداس ہو گیا۔

انگریزی کہاوت ہے — خواہش کو دبانا نہیں بلکہ اُس کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے۔ لیکن میرا تجربہ یہ رہا کہ خواہش کے سامنے بار بار سر جھکا کر بھی اُس کو میں جیت نہ سکا۔ میری آتما کی پیاس بار بار بجھا کر بھی بجھ نہ سکی۔ شمیمہ کی تنبیہ کے باوجود اُس کے یہاں بار بار جانے کو جی چاہتا۔ جس طرح شرابی کو جب شراب میسر نہیں ہوتی تو وہ بھٹی کے ارد گرد جا کر وہاں کی فضا سے مسرور ہو آتا ہے اسی طرح میں شمیمہ کے مکان کے گرد چکّر لگا کر اپنا جی بہلا آتا تھا۔

اُس دن پھر دل نے میرے اوپر قابو پا لیا۔ شام کا وقت تھا۔

سامنے والے بڑے کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ میں آہستہ سے اندر جاکر کونے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے بغل کے کمرہ میں تخت پر کوئی آدمی ایک موٹے تکیے پر منہ کے بل پڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک گلاس میں شراب رکھی تھی، جس میں سوڈے کے بلبلے اب بھی اٹھ رہے تھے۔ شراب کی بوتل اور دو سوڈے کی بوتلیں نیچے رکھی تھیں۔ گلاس میں برف کا ٹکڑا گل کر چھوٹا ہو گیا تھا۔ اگالدان کے منھ پر پان کی ایک بھدی پیک پڑی تھی۔ اس آدمی کے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ منہ لال ہو گیا تھا اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ گلاس پہ ہاتھ رکھے منہ کے بل تکیے پر پڑا تھا۔ میں نے ذرا جھک کر دیکھا۔ موتیوں کی جھلملی کے پیچھے زرینہ پلنگ پر نیچے پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی گلاس تھا۔ اور آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ شرابی پر نظریں گڑائے دیکھ رہی تھی۔

اپنی آنکھوں سے یہ کیا دیکھ رہا ہوں! زرینہ شرابی!! زرینہ جو سیدھی سادی کی زندگی کی رہبر ہے!!! میں بیٹھا سوچتا رہا اور جب سوچ نہ سکا تو دیکھتا رہا۔ شرابی نے نشے پر قابو پانے کی کوشش میں آنکھیں اٹھا کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ نہ راجہ صاحب نہ انکم ٹیکس کے افسر۔ آخر یہ تیسرا کون؟ کیا بہت سے ایسے بدمعاشوں کا گذر زرینہ کے یہاں ہے؟ پھر سوچنے کی کوشش کی۔ اسی درمیان زرینہ اس کی آنکھوں کا اشارہ پاکر اٹھی اور بوتل سے

شراب اُس کے گلاس میں اُنڈیلنے لگی۔ اُس کے ضد کرنے پر تھوڑی سی شراب اپنے گلاس میں بھی ڈال لیا اور پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ شرابی پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ زرینہ کو اُس نے پاس بیٹھنے کی دعوت دی۔ اور جب وہ نہ مانی تو اپنے گلاس کی شراب زرینہ کے اوپر پھینکنے کے لئے گلاس اُٹھایا۔ زرینہ ہنستی ہوئی اُس کے سرہانے جا کر بیٹھ گئی۔

اب میں صرف زرینہ کو دیکھ سکتا تھا۔ شرابی زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اُس کی انگلیاں توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرینہ ہنستی ہوئی انگلیاں چھڑا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ شرابی کے ساتھ اتنی ہمدردی! اتنی مہربانی اُس کے اوپر! میرا شعور زور زور سے کانوں میں چیخ رہا تھا۔ شرابی نے ٹٹول کر اپنا بایاں ہاتھ زرینہ کی جانگھ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے گلاس خالی کر دیا۔ زرینہ نے جتنی شراب بچ رہی تھی شرابی کے گلاس میں انڈیل دی اور جھک کر خالی بوتلیں تخت کے نیچے رکھنے لگی۔ شرابی نے اُس کی جانگھ میں اُنگلیاں گڑاتے ہوئے دوسرے گلاس کو بھی خالی کر کے اُسے تخت پر اُلٹ دیا۔ شرابی کو زرینہ کی جانگھ میں اُنگلیاں گڑاتے دیکھ کر میرے دل نے آنکھوں سے پوچھا۔ دہی جانگھیں!

معلوم نہیں اُس حالت میں کب تک پڑا رہا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور اس کا احساس نہیں کہ میں سویا جاگ رہا تھا۔ یکایک کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا، آنکھیں کھل گئیں۔ سامنے زرینہ کھڑی تھی۔

شرابی منہ کے بل تخت پر پڑا سو گیا تھا اور اس کے منہ سے سرخ لال ٹپک کر نکلے پر بہہ رہی تھی۔ زرینہ کے اشارے پر میں اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ کوٹھے پر اپنے کمرے میں لے گئی۔ خود چارپائی پر پڑ گئی۔ تھکا اور ٹھنسا یا میں بھی اس کے بغل میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر خاموش ہم دونوں اسی حالت میں پڑے رہے۔ پھر کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ زرینہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ زرینہ کی بڑی بہن تھی ہم دونوں کو دیکھ کر الٹے پاؤں کمرہ سے باہر چلی گئی۔ زرینہ کچھ سوچتی ہوئی پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی میں اپنی جگہ پڑا رہا۔ اتنے میں زرینہ کی ماں کی آواز کمرہ کے باہر برآمدہ میں سنائی دی " زرینہ کیا کر رہی ہے؟" اس سوال کے بعد اس کی آواز، اور سخت ہو گئی " تیری جیسی کئی زرینہ جن کر بیٹھی ہوں، چلی ہے جو عشق کرنے! سارے شہر کے لونڈوں کا یہ کوئی ٹھکانا ہے!" زرینہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور میں آہستہ آہستہ کھسک کی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرینہ کی ماں کی آواز صحن میں غائب ہو گئی۔ جہاں تک میرا سوال تھا میری خودی کو زبردست ٹھیس لگی تھی۔ زرینہ کی آنکھوں کے آگے میری بڑی بے عزتی ہو گئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرے کے باہر نکلا۔ نیچے برآمدہ میں پہنچ کر اس نے دھیرے سے کہا " جاؤ میں لکھوں گی " اور میں چور کی طرح وہاں سے بھاگتا ہوا گھر لوٹ رہا تھا۔

...... ٹرین چل چکی تھی۔ سکنڈ کلاس ڈبے میں ہم بیٹھے تھے۔

اُن کے اور میرے سوا ڈبے میں اور کوئی نہ تھا۔ میرے ہی برتھ پر وہ دوسرے کنارے پر بیٹھی تھیں لیکن داہنے رخ پر ساڑی کا پلو اس طرح پڑ رہا تھا کہ میں اُنھیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ گاڑی چلنے پر میرے دل میں جو پہلی خواہش پیدا ہوئی وہ تھی اُن کو دیکھنے کی۔ ویسے تو ان کی خوبصورتی کی تعریف دوسروں کے مُنہ سے میں نے سُنی تھی۔ لیکن آج تو اپنی ہی آنکھوں کا اعتبار کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ گھر والوں سے جدا ہونے کا اُنھیں بڑا رنج ہوگا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی ہیں اس لئے ان کا رنج دور کرنے اور اپنے دل کی پیاس بجھانے کی غرض سے میں نے اُن کے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ رکھنا چاہا۔ حالانکہ سماج نے قانون کی زنجیروں میں باندھ کر اُنھیں میرے حوالے کر دیا تھا، لیکن پھر بھی ایک انجان عورت پر جس کی صورت سے بھی میں آشنا نہ تھا ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے ڈر سا لگا۔ ایک بار اُن کو چھونا چاہا، لیکن ہاتھ کانپ کر رہ گیا۔ پھر ہمت کر کے میں نے مسکراتے ہوئے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ خوف اور شرم سے میرے غیر مانوس ہاتھ کے نیچے جیسے وہ دبی جا رہی تھیں۔ پھر بھی اُنھوں نے میری طرف نہیں دیکھا۔ میں نے اُنھیں اپنے پاس کھینچنا چاہا لیکن جب کامیابی نہیں ہوئی تو میں نے جھک کر اُن کی تھوڑی پکڑ کر شرارت سے کہا "مجھ سے بھی کیا شرم! آپ تو اب میری ہیں"۔ یہ کتنے وقت میں نے اپنی بھوکی نگاہوں سے اُنھیں دیکھا۔ کلیجہ دھک سے

رہ گیا۔ زرینہ! وہی آنکھیں، وہی صورت، وہی معصوم ادائیں ۔
زرینہ کی صرف مسکراہٹ نہیں تھی، نہیں زرینہ نہیں، یہ میری دھرم پتنی
ہیں۔ میرے ضمیر نے آواز دی اور میں اپنے دل کی اس شاعری کو کوسنے
لگا جو ہر پیکر حسن میں زرینہ کو ڈھونڈھتی تھی۔ میں نے سوچا یہ تو میری
بیوی ہیں۔ ہندو گھر کی نئی دلھن اپنی کے سامنے کیسے مسکرا سکتی تھی۔
نیچی نگاہوں سے کسی دوسری طرف دیکھ رہی تھیں حسین چہرہ، دو
رنگ کا نکھار، ماتھے کا سیندور، کانوں اور گلے میں جھومتے جھالنے ہوئے
سونے اور نگوں کے جڑاؤ گہنے۔ باریک ریشمی ساڑی میں سے جیسے اُن کا
حسن جھانک رہا تھا۔
پلنگ پر لیٹا خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے
ہوا میں محل بناتا اور اُس محل میں اپنی نئی بیوی کو دیکھنا چاہتا۔ لیکن
بار بار اُس میں زرینہ نظر آتی اور میں جھنجھلا کر دھوئیں کے محل کو ہاتھ
ہاتھ سے مار کر بار بار بگاڑ دیتا۔ اتنے میں میں نے محسوس کیا کہ میرے
سرہانے کوئی کھڑا ہے۔ لوٹ کر دیکھا میری بیوی چاندی کی طشتری
میں پان الائچی لئے کھڑی تھیں۔ تکئے کے نیچے ہاتھ ڈال کر، بھابھی کی
تاکید کے مطابق، گنّی نکال کر طشتری میں رکھ دی۔ زرینہ پھر مجھے یاد آئی۔
جب میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑی ہیں تو دو گلوریاں خود لے کر کھالیں۔
اچانک مجھے اُس مسافر کا خیال آیا۔ جسے میں نے ایک بار تھک کر راستہ
کے کنارے بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں دباتے دیکھا تھا لیکن

میری بیوی کے چہرہ کا رنگ نہیں بدلا۔ اُنھوں نے طشتری اُٹھا کر میز پر رکھ دی۔ طشتری میں گنّی دیکھ کر کمبخت زرینہ کا خیال بُری طرح ستا رہا تھا۔

طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی نرم اور رنگین کرنے جھنگلے سے داخل ہو کر میرے پلنگ پر پڑ رہی تھیں میں آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سورج کی لمبی لمبی کرنوں کی روشنی میں میری بیوی کی کلائی گلے اور کان کے گہنے دمک رہے تھے۔ وہ اب تک سوئی تھیں۔ ان کی طرف دیکھا۔ گہنوں اور ساڑی سے لے کر اُن کی پیشانی تک ہر چیز زرد دکھائی دی۔ آخری شاعرانہ اُمنگیں اصلیت کی دنیا میں پیلے سونے اور پیلی صورت سے مس ہو کر خودکشی کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی سانس کی حرکت سے ہار کی کمانی دار سونے کی تتلیاں کانپ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا سورج کی کرنوں نے تتلیوں میں جان ڈال دی ہے۔ اور وہ ابھی رنگین کرنوں پر بل کھاتی ہوئی اُڑ جائیں گی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کمرہ میں آ رہی تھی جس سے میری بیوی کے رخسار پر بکھرے ہوئے بال ہلکے ہلکے اُڑ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا جس تتلی کے کمانی دار پر ٹوٹ گئے تھے وہی تتلی بے حس پڑی تھی۔

لیکن میرے لئے شادی بھی اپنے ساتھ راحت نہ لائی۔ دل میں زرینہ کی طرف سے نفرت روز بروز بڑھتی جاتی۔ مگر اُس کا خیال

دل سے نہ جاتا۔ اُس کی یاد آتے ہی میرا غصہ بڑھنے لگتا، اور میری بیوی جو اب مجھ سے آہستہ آہستہ ملنے لگی تھیں، میرے منٹ منٹ پر احساس کے تغیرات کو دیکھ کر ایک قدم آگے بڑھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔

اُسی سلسلہ میں ایک دن ڈاک کے ذریعہ ایک قیمتی ساڑی میری بیوی کے واسطے شادی کے تحفے میں آئی۔ پارسل پر بھیجنے والے کا نام پتہ نہیں تھا۔ صرف لکھا تھا "ایک دوست کی طرف سے"۔ میں نے پیسہ والوں کو گم نام خیرات کرتے سُنا تھا۔ لیکن یہ گُم نام تحفہ بھیجنے کا طریقہ بھی ایک ہی رہا اور مجھے پسند آیا۔ اگر چڑھ ہوئی تو اس بات سے کہ اس گُمنام طریقے سے وہ میری زندگی میں پھر سے کیوں داخل ہوئی۔

باغوں میں جب پھول کھلنے لگتے ہیں تو بسنت کا چھپ کر آنا بھی سب پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا راز اوروں کو بھی معلوم ہو چکا تھا۔ اپنی لاعلمی میں اپنی شادی کو میں صرف وقت کا ایک اتفاق سمجھتا تھا۔ ایک دن صبح کو ٹہل کر واپس لوٹا تو دیکھا کہ میز کے پاس کپڑا جلا پڑا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بیوی نے ساڑی غصہ میں جلا کر خاک کر دیا تھا۔ دو سو روپئے کی تحفہ کی جلی ہوئی سیاہی نے میری آنکھوں میں جلن پیدا کر دی۔ ولایتی کپڑے جلائے جانے کے دنوں کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔

میں سوچنے لگا یہ بھی بائیکاٹ کا کیا قیمتی طریقہ ہے۔ لیکن زرینہ کی بات ان سے کہی کس نے؟ اپنی بھابی کا خیال آیا۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔ ایک دم جی چاہا کہ سامنے جو عورت کھڑی تھی اُس کا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن وہ میری بیوی تھیں۔

شہر سے دو میل کے فاصلہ پر ایک پارک ہے۔ جب سے دنیا کے جنجال سے دور جا کر وقت گزارنے کی عادت پڑی تھی، اُسی وقت سے میں اس پارک سے مانوس ہوں۔ شہر کی بھیڑ بھاڑ اور گندگی سے بہت دور، سول لائنس کی امیری سے ذرا بچ کر، دریا سے تھوڑی دور یہ پارک کئی میل کی لمبائی چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔ میں نے یہی ایک پارک پایا جس میں آدمی عام طور پر بہت کم ملتے تھے۔ اس سے پہلے میں یہاں صبح کے وقت آیا ہوں، شام کو آیا ہوں اور رات کو بھی۔ لیکن اُس روز رات کو ۹ بجے خود کو وہاں پا کر عجیب محسوس کر رہا تھا۔ ہلکی چاندنی جیسے پارک کی ہری گھاس اور پھولوں پر سو گئی تھی۔ بڑے بڑے درخت اپنی مبہم خاموشی میں ساکت کھڑے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں راستہ کے کنارے بڑی بڑی گھاس میں پڑی ہوئی لوہے کی کُرسی پر قریب آدھ گھنٹے سے خاموش بیٹھا تھا۔ سر کے اوپر سیمر کا ایک بڑا درخت کھڑا تھا۔ ہر دم بڑے بڑے لال پھول زمین پر گرتے۔ جب کوئی پھول آسمان سے زمین پر گر کر گرتا تو میری نظر اُس کی طرف جاتی۔

وہ اپنے زوال کی سرخ کہانی سناتا ہی ہوتا کہ اتنے میں دوسرا پھول پھٹ سے زمین پر گر پڑتا۔ ہر پھول کے گرنے کم سے کم دو آوازیں پیدا ہوتیں۔ ایک کسی ڈال سے ٹکرانے کی اور دوسری زمین پر گرنے کی۔ سیمر کے بھاری پھولوں کے ٹپکنے کی آواز سے گھرا ہوا میں کرسی پر بیٹھا تھا۔

بیٹھا بیٹھا جب میں اپنے خیالوں میں کھو جاتا تو کوئی سیمر کا پھول زمین پر گر کر مجھے جگا دیتا۔ میں سمجھتا زرینہ آگئی کتنی ہی بار اس جگہ زرینہ مجھ سے ملی تھی۔ جب سے میں نے اس کے گھر جانا چھوڑا تھا وہ یہیں مجھ سے ملتی تھی۔ آج مجھے اس کی آخری ملاقات یاد آرہی تھی۔ میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اداسی سے مسکرا کر مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت میری شادی کی بات چل رہی تھی جس نے میرے اندر ایک نئی خواہش پیدا کر دی تھی۔ میں اس تصور سے ناچ اٹھا۔ زرینہ میری ہو جائے گی۔ میں خوشی سے پھولا ہوا زرینہ سے یہاں ملنے آیا۔ اسے شام کو کہیں گانے جانا تھا۔ اکثر ایسے موقعوں پر یہاں اس طرح ملنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتی تھی۔ زرینہ دور دور ہی تھی کہ اس کی زری کی ساڑی کا عکس میری آنکھوں کی پتلیوں میں جھلکنے لگا۔ زرینہ آکر تھکی ہوئی میری بغل میں آسی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ باسی پھول جیسی لگا۔ شادی کی بات سن کر وہ اداس ہنسی ہنسنے لگی۔ میں اس بات کو لاکھ طرح سے اٹھاتا اور ہر طرح سے التجا کرتا لیکن میری بات ٹالتی ہی گئی۔ جب مجھے غصہ آنے

لگا تو اُس نے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر میرا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔
"شادی کر لیں میں بھی بہو دیکھنے آؤں گی"۔
غصہ بڑھنے لگا۔ کُرسی سے اُٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ کمر پہ باندھ کر ٹہلنے لگا۔ بار بار یہی سوچتا، اُسی نے میری شادی کرائی اور میری زندگی برباد کی۔ اس ذہنی کشمکش کی وجہ سے ماتھا گرم ہو گیا تھا۔ اندر سے بغاوت کا ایک طوفان اُمڈا آ رہا تھا۔ ایک بھاری پھول پٹ سے زمین پر گرا۔ زرینہ کے پیر کی آواز! میں اُس کو دیکھ کر کُرسی پہ بیٹھ گیا۔ نزدیک آکر اُس نے کہا" میں نے کہا آداب عرض" کُرسی پہ بیٹھتے ہوئے "کہئے خیریت تو ہے، بہت دنوں بعد ملے"۔ "آپ کی مہربانی"۔ "کیوں؟ خیریت تو؟ کچھ روٹھے سے لگ رہے ہو، بہو نے کچھ کہا تو نہیں؟" "سب تمہاری مہربانی ہے"۔ "کیوں کیا بات ہے؟ کچھ کہو بھی سہی۔ جب سے شادی ہوئی تم ملے نہیں۔ سوچا چلوں مل آؤں"۔ "اچھا سوچا۔ میں بھی ملنا چاہتا تھا"۔ "لیکن کچھ کہو تو، آخر کیوں ایسی روکھی روکھی باتیں کر رہے ہو؟ میرا جی گھبرا رہا ہے۔ میں تو خوشی خوشی ملنے آئی۔ سوچا بہت دنوں بعد ملاقات ہو گی، باتیں کر کے جی بہلاؤں گی، اور ایک تم ہو کہ روٹھے بیٹھے ہو"۔
زرینہ! جو کچھ تم نے کہا میں نے کیا اُسی کا نتیجہ ہے کہ آج میں کہیں کا نہ رہا۔ میں ناراض نہیں ہوں۔ میرا ہے ہی کون جس سے میں ناراض ہو سکوں ......" "کیا بہو سے ——" "بہو بہت

اپنی زندگی سے ......" زرینہ! جھوٹ مت بولو۔ تم خوش نہیں تھیں ......" "یہ تمھیں کیسے معلوم؟ میں آج سے کہیں زیادہ خوش تھی......"
"اُن شرابیوں اور بدمعاشوں کے ساتھ......؟" "ہاں، لیکن تم دونوں کے رنج کی وجہ بن کر خوش نہیں ہوں۔ گندگی میں رہتی تھی اور اُسی میں میں خوش تھی کیوں کہ وہی میری زندگی تھی۔ بگڑے ہوئے میرے پاس آتے، میں اُنھیں اور بگاڑتی یا بناتی۔ اسی لئے شاید وہ میرے پاس آتے بھی تھے، اُسی کے لئے سماج نے ہم کو شہر کے کنارے اُس محلہ میں بٹھا دیا تھا۔ جن کو دنیا میں کوئی بھی خوش نہ کر سکتا تھا وہ مجھ میں راحت ڈھونڈتے آتے تھے۔ جن کا سنسار میں کوئی نہ ہوتا وہ مجھے اپناتے۔ میں اُس آتی، جاتی، بنتی بگڑتی، دنیا میں رہ کر بھی خوش تھی، سکھی تھی......" "شراب پی کر؟" "ہاں شراب پی کر، وہی شراب جس سے تمھیں نفرت ہے اور جو تم کو میں نے نہیں پلائی، شراب پینا اور اُس زندگی میں رہنا مجھے پسند تھا...... مگر میرے دل میں کوئی ایسا تھا جس کو میں جیت نہ پائی تھی۔ اپنے من کے اُسی چہرہ کے سے میں نے تمھیں دیکھا اور......" "اور میری شادی کرادی——" "وہ میری جیت تھی...... اپنے آنسوؤں کا ہار تمھارے گلے میں ڈال کر میں نے کہا جاؤ شادی کرلو۔ آنسو میری محبت کے یادگار تھے اپنی خود غرضی پر میں نے تم کو قربان نہیں کیا۔ لیکن چونکہ تم مجھ سے بہت امید کرنے لگے تھے اسی لئے آج اس طرح مجھے......"

اُس کی باتیں سُنتے سُنتے مَیں اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ "تم سے اپنی زندگی کو سُکھی بنانے کی کوشش کرنا میری بھول تھی۔ میں نہیں سوچ سکتی تھی کہ دُنیا میں کسی اور کا سُکھ کم کر کے ہی کوئی سُکھی ہو سکتا ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ کھڑے کیوں ہو؟"

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "سوچ رہا تھا، بہت دیر ہو رہی ہے۔"

زرینہ ایک دم رُک کر کہنے لگی۔ "ہاں چلو چلتی ہوں۔ میں تم سے محبّت کرتی تھی اس لئے تمہارا بُرا نہیں چاہا (پارک کے کسی کونے سے لومڑی کے رونے کی آواز آنے لگی) مجھے اُمید ہے تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو گے (لومڑی زور زور سے رو رہی تھی) ایک شخص دو انسانوں کو ایک ساتھ شاید آج سُکھی نہیں نہیں بنا سکتا۔ وہ چاہے میں ہوں یا تم۔ مجھے اُمید ہے تم مجھے غلط نہ سمجھو گے" (ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لومڑی روتی ہوئی ہم لوگوں کی طرف بھٹکتی آ رہی تھی) میں چلتے چلتے رُک گیا۔ اور مُڑ کر اُس سے کہا۔ "زرینہ!"

(لومڑی بالکل میرے پیچھے آ کر رونے لگی) اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ——— "بھول جاؤ کچھ ہوا" لومڑی خاموش تھی۔ اندھیری جھاڑی میں اُس کی آنکھیں میرے سامنے چمک رہی تھیں۔

سات سال بعد ———

اب میں دو بچّوں کا باپ ہوں۔ لکھا پڑھا آدمی۔ اپنے بچوں کو پیار اور بیوی کی عزّت کرتا ہوں۔ کسی چیز کی کمی نہیں محسوس کرتا۔

ویسے آج کی زندگی ہی ایسی ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس کے پاس سب کچھ ہو۔

اصل میں کسی چیز کے بارے میں اُسے الگ کر کے نہیں سوچا جا سکتا۔

ہر چیز دوسری چیز کے مقابلے میں ہم کو چھوٹی یا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اپنے بارے میں بھی اپنے سے اوپر اور نیچے کے لوگوں کو دماغ میں رکھے بغیر کیسے سوچ سکتا ہوں۔ اور پھر اس زمانہ میں تو ہر آدمی کو شکایت ہے کہ اُسے زندگی سے اتنا نہیں ملا جتنا وہ سمجھتا ہے کہ اُسے ملنا چاہیے تھا لیکن بقول شخصے۔ ع

زندہ ہر اک چیز ہے کوشش ناتمام سے

یہ دوسری بات ہے کہ آئے دن ہماری خواہشات پوری نہیں ہوتیں لیکن آج کو کل کی روشنی میں منوّر دیکھ کر خود کو تسکین دے لیتا ہوں۔ اگر ہم کو ایسی دنیا نہیں ملتی جس کی ہم نے ایک خیالی تصویر بنا رکھی ہے تو شاید اُس کی یہ وجہ ہے کہ شروع ہی سے ہم دو دنیاؤں میں رہتے آئے ہیں۔ ایک وہ دُنیا جس کے بارے میں ہم نے پڑھا اور سوچا اور جس کی بنا پر دماغ میں ایک نئی دنیا کے نقش بنائے۔ وہ دنیا ہمارے دماغ کی ہے اور دوسری دنیا ہماری آنکھوں کے سامنے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے لیکن میں اس سے پریشان نہیں ہوتا کیونکہ سوچتا ہوں اسی فرق کی بنا پر انسان کی مسلسل ترقی کا مدار ہے۔

خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ نسبتاً میں اپنے کو سکھی پاتا ہوں۔ چھوٹے پیمانے پر میری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ ازدواجی زندگی بھی سکھی ہے۔ اپنے بال بچوں میں اپنے کو خوش پا کر خوش ہوتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھ میں اوروں کے مقابلے میں ایک طرح کی برتری کا بھی احساس کبھی کبھی ہوتا ہے۔ میں نے اکثر ایسا محسوس کیا ہے کہ جیسے میری جڑیں آم، املی، پیپل یا برگد کے درختوں کی طرح نیچے تک گئی ہیں۔ دوسرے میرے مقابلہ میں گملوں میں اگے ہوئے پودوں کی طرح لگتے ہیں۔ بس دھکا لگا نہیں کہ وہ اپنے گملوں سمیت زمین پر ڈھلک جائیں گے۔

شام کو اپنے برآمدہ میں آرام کرسی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا سامنے سڑک پر ایک تانگا رکا۔ ادھیر عمر کی بھرے بدن کی ایک عورت سفید ساڑی پہنے تانگے سے اترنے لگی۔ ماتھے پر گھونگھریالے بالوں کے دو گچھے دونوں طرف لٹکے ہوئے اس عورت کے بیتے ہوئے حسن کی کہانی سنا رہے تھے۔ عام طور سے اس نئے محلہ میں ہر آدمی راستہ بھولا ہوا آتا ہے۔ میں نے سوچا ضرور شریمتی جی ضرور کسی کا مکان پوچھنا چاہتی ہیں۔ لیکن دیکھتے دیکھتے وہ میرے برآمدہ میں آ گئیں۔ حالانکہ میں ان سے واقف نہ تھا لیکن ان کی نسوانیت کے احترام میں کرسی چھوڑ کر اٹھنا ہی پڑا۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کیا۔ میں نے بھی غیر ارادی طور پر جواب میں ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ مسکرا پڑیں۔ میرا دل چیخ اٹھا، زرینہ! میں نے اسے پہچانا اور گھبرایا ہوا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کوئی دیکھ تو نہیں

رہا ہے۔ اُس کے ساتھ بڑے کمرے میں آیا۔ فوراً بیوی کا خیال آیا۔
لیکن وہ ان دنوں میکے گئی ہوئی ہیں۔ اندر بھی جب مجھے چین نہ ملا تو اُس کے ساتھ
کانپتی ہوئی جانگھوں سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ جیسے اتنی قیمتی چیز
پا گیا تھا کہ اُسے چھپانے کو کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ ایسے ہی جیسے
کتّا روٹی کا ٹکڑا پا کر کوئی کونا تلاش کرنے بھاگتا ہے۔

اوپر کمرے میں آ کر میں نے اُس سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ریڈیو کو ایک
کونے میں دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے پوچھا "آپ ہنستی کیوں ہیں؟" ذرا
مسکراتے ہوئے جواب دیا "یوں ہی" میں نے پوچھا "کہیے آپ مزے
میں تھیں؟" ——— "آپ کی مہربانی" "ادھر کیسے آنا ہوا؟" ——— "بنارس
تک ایک 'پیٹرے' کے سلسلے میں آئی تھی۔ سوچا آپ سے بھی ملتی چلوں"
لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ "میرا پتہ؟" اُس نے ریڈیو کی طرف
مسکراتے ہوئے دیکھا "میں نے ریڈیو پر سنا تھا" میں تعجب سے اُس کی طرف
دیکھتا رہ گیا۔ ذرا سوچنے پر خیال آیا۔ شرم سے سر جھک گیا۔ بہت دن
ہوئے ریڈیو والوں کو میں نے خط لکھا تھا۔ ریڈیو پروگرام کے بارے
میں اور نرملا کے گانے کی تعریف کرتے ہوئے میں نے صلاح دی تھی
کہ اُسے اکثر گانے کے واسطے بلایا جائے" "لیکن وہ چٹھی آپ کو کیسے
ملی ہے؟" ——— "چٹھی کا جواب میں نے سنا تھا" "اچھا! میں نے نہیں سنا"
——— "جی ہاں، آپ نے بڑی مہربانی کی، میرا کئی بار لکھنؤ جانا ہوا۔
پر کبھی مل نہ پائی آپ سے ....." میں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا ——— "جی ہاں

میں نے اپنے کچھ ساتھیوں سے ویسے خط لکھنے کو کہہ دیا تھا" زرینہ مسکراتی ہوئی بولی "آپ مجھے بھولے نہیں، یہی میرے لئے کیا کم تھا۔"
"میں نے ہنستے ہوئے نوکر کو آواز دی، اور چائے لانے کو کہا" "جی نہیں تکلیف نہ اُٹھایئے! میں نے اسٹیشن پر ہی پی لی تھی" میں نے اس بات سے ذرا غیر مطمئن ہو کر کہا "آپ میرے وہاں آ ہی نہیں تو ——" اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "جی نہیں، یہ بات نہیں، میں نے سوچا آپ سے ملاقات ہو نہ ہو۔" "یہ بیٹھے دیکھئے بہت ہوا۔ پان سے تو اعتراض نہیں" ؟ میں نے نوکر سے پان لانے کو کہا۔

اس دوران میں اُس کی نظر فوٹو اسٹینڈ پر پڑی۔ زرینہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا "یہ ایک لڑکی ہے؟" میں نے تصویر میں دیکھا۔ میری دھرم پتنی میرے پہلو میں بیٹھی تھیں اور سامنے ہماری لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے جواب دیا۔ "جی نہیں ایک بچہ گود میں ہے" تصویر پر آنکھیں جماتے ہوئے اُس نے پوچھا "آپ کی بیوی تو شریمتی ہیں؟" لڑکا میری اپنی بیوی کے کندھے پہ ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ شرماتے ہوئے میں نے کہا۔

"جی ہاں، شریمتی ہیں۔"

نوکر نے پان لا کر دیا۔ پان کھاتے ہوئے سنجیدگی سے زرینہ نے کہا۔ "میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آئی تھی۔ وقت زیادہ نہیں، ابھی گاڑی سے لکھنؤ جانا ہے۔" میں چونک پڑا۔ "لیکن آپ نے تو کہا تھا بنارس ——" "جی نہیں کل لکھنؤ میں پروگرام ہے۔" سامنے پڑا ہوا

"لسنر" میں اُلٹنے لگا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی "میرا اس طرح یہاں آنا معاف کیجئے گا۔ کچھ دنوں سے برابر آنے کو سوچ رہی تھی۔ آنا ضروری تھا" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی منی بیگ کھولنے لگی۔ میں تعجب سے منی بیگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "آپ کو یاد ہوگا" یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک چھوٹی سی دو موتیوں کی نتھ نکالی۔ "آپ اسے پہچانتے ہوں گے ——— یہ اُس وقت اُتر چکی تھی، اس کے اُتارے جانے میں میری ماں کا ہاتھ تھا۔ وہ میری رسم نہیں تھی۔ لیکن میں ایک ایسے آدمی کی تلاش میں تھی جس کو اسے نذر کرسکتی، جو عورت کو پہچانتا اور اُس کی قیمت سمجھتا ہو....

اُس دن ریڈیو پر آپ کا خطاب سن کر میں نے سوچا، آپ عورت کی اُس عزّت کا شاید بوجھ اُٹھا سکیں" نتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر وہ کرسی سے اُٹھنے لگی۔ میں نے پریشان نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے شک کی حالت میں اُس سے پوچھا "لیکن میں اسے کیا کروں؟" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "یہ آپ کی چیز ہے، اِس میں عورت کی لاج اور عزّت دونوں ہے۔ یہ امانت آپ کے پاس رہنی چاہیئے" یہ کہکر وہ چلنے لگی۔ میں نے بے چین ہوکر کہا ——— "لیکن ایسی جلدی کیا ہے؟ آج رہ جائیے۔ کل صبح بھی لکھنؤ جا سکتی ہیں" کمرہ کے چاروں طرف دیکھ کر پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے اُس نے کہا "یہ میرے ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ مجھے جانا ہی ہوگا" یہ کہتے ہوئے وہ سیڑھی سے اُترنے لگی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "پھر کب ملاقات ہوگی؟" اُس نے مڑ کر

میری آنکھوں میں دیکھا۔ دیکھئے کب، زندگی کا کیا ٹھکانا۔" یہ کہتے کہتے وہ ساڑی کا کونا اُٹھا کر اپنی آنکھوں تک لے گئی۔

میں دروازہ پر کھڑا تھا۔ تانگا چلا جا رہا تھا۔ وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ ریتہ کتنی بدل گئی ہے۔ اُس کی عمر کس تیزی سے ڈھلتی جا رہی ہے۔ اُس کا کہنا یاد آیا۔ "زندگی کا کیا ٹھکانا" اور میں کانپ اُٹھا۔

خیالوں میں ڈوبا ہوا اوپر کمرے میں واپس آیا۔ چھوٹی میز پر ریتہ کی امانت پڑی تھی۔ کہاں رکھوں اسے؟ یہی سوال بار بار اُٹھتا۔ چھوٹی سی چیز کتنی بھاری معلوم ہونے لگی۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا۔ جیسے کسی نے میرے گلے میں پتھر کی بھاری چکی ڈال دی ہو۔ کچھ دیر اُسے ہاتھ میں لئے اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد بکس کھولا اور اُس کی تہہ میں رکھ دی۔ پھر کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد میں پھر بے چین ہونے لگا۔ جا کر بکس کھولا۔ تنخہ کو ڈھونڈھنے وقت سونے کی گھڑی ملی۔ اِس بات سے خوشی ہوئی کہ اتنی دیر میں اُس نے اپنا ساتھی بھی ڈھونڈھ لیا تھا۔ اب میں دونوں چیزوں کو ہاتھ میں لئے کمرہ میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ پھر الماری کھولی۔ الماری کے اندر بیچ کے خانے میں دیوار پر ایک تصویر دو کیلوں پر ٹھہری نظر آئی۔

تیئیس سال پہلے آسمان پر اُتر کی طرف ایک بڑا ستارہ چمکا تھا جس کی سُرخ روشنی دنیا کے پانچویں حصّہ پر آج بھی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اُسی

لال ستارہ کی تصویر ہے۔ چکنا سر، چمکتی ہوئی گہری آنکھیں، بھدی ناک، مضبوط جبڑے اور چھوٹی سی داڑھی! ——— دیکھنے میں وہ آدمی چوروں کا سردار معلوم ہوتا ہے چوروں اور ٹھگوں سے زندگی میں اس کا گہرا تعلق بھی رہا۔ اس کی تصویر کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ تصویر دو کیلوں پر ٹھہری تھی۔ ایک کیل پر تھیلا اور دوسری پر گھڑی میں نے لٹکا دی۔

سونے کی نقلی گھڑی میں میرا ماضی چھپا ہوا تھا۔ اور اصلی سونے کی تھیلا میں میرے مستقبل کا بوجھ! ایک کے بغیر دوسرا ممکن نہیں۔ تھیلا کا بوجھ میں تنہا نہیں اٹھا سکتا تھا اس لئے اس تصویر کو اپنا ساتھی بنایا۔

کشتی نامحرم

"مجھے کشتی کی ضرورت نہیں" حسین دوشیزہ نے کسی قدر برہم ہوکر کہا۔

"کشتی؟ معاف کیجئے گا، میں ملاح نہیں ہوں" عابد نے گھبرا کر جواب دیا۔

"پھر آپ نے مجھ سے گفتگو کرنے کی جرأت کیسے کی؟" دوشیزہ نے کہا "آپ میرے کام میں حارج ہوئے"

"واقعی خطاوار ہوں، معافی چاہتا ہوں" عابد کسی قدر گلوگیر ہوکر بولا۔

"مگر معافی مانگنے سے میرے نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی" دوشیزہ تیز آواز میں بولی۔

"پھر جو سزا آپ تجویز کریں، میں نے دور سے اندازہ لگایا کہ آپ بیکار بیٹھی ہیں، آپ کے اوزار بھی بیکار رکھے ہیں"
عابد نے آہستہ آہستہ کہا۔

لڑکی بولی "تو آپ کے خیال میں مجھے ماڈل کی ضرورت ہوگی"
"جی ہاں!" عابد نے کہا "یہی خیال مجھ کو یہاں تک لے آیا"
اگر عابد اس وسیع میدان میں تنہا نہ ہوتا تو شاید اس کی اتنی جرات نہ ہوتی کہ وہ ایک نامحرم لڑکی سے اس طرح گفتگو کرتا۔ پہلے تو وہ دبے پاؤں اس کے پاس پہنچا مگر اس نے دیکھا کہ وہ کسی خیال میں محو، دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی ہے۔ اس نے دیکھا کہ مصوری کے تمام آلات اس کے پاس موجود ہیں۔ دو کھانی، اسٹول، میز اور کینوس.....
مگر اس کے پاس کوئی ماڈل نہیں ہے۔ یہ خیال آتے ہی عابد نے اس کو متوجہ کر کے اس کے لئے کام مہیا کرنا چاہا، مگر فوراً ہی اس کو اپنے کپڑوں کا خیال آیا۔ راستہ کے گرد و غبار نے ان کو میلا کر دیا تھا۔ مدراسی کپڑے کا کوٹ، لٹھے کا پیجامہ اسے موزوں نظر نہ آئے، وہ فوراً ہی دریا کی طرف بڑھا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
وہ بدھو سیل تور کے جھونپڑے میں گھس گیا اور اس سے بولا۔
"بدھو مجھے اس وقت ایک عمدہ سوٹ کی سخت ضرورت ہے"
"لالہ سیتا رام کا ریشمی سوٹ تیار ہے" بدھو نے کہا "وہی پہن لیجئے"

"میرے کپڑے اس کے عوض میں رکھ لو" عابد نے کہا "میں تھوڑی دیر میں اُن کو واپس کر دوں گا...... اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی دھلائی بھی دیدوں گا"

"بہت اچھا سرکار" بدھو بولا۔

عابد نے جھاڑی کی اوٹ لی، کپڑے بدلے اور بدھو کو دلاسا دیکر سامنے والے ٹیلے کی طرف روانہ ہوا جہاں وہ دوشیزہ تنہائی سے باتیں کر رہی تھی۔ اُس کے پیروں کی آہٹ نے اُس کے سکوت کو گفتگو میں تبدیل کر دیا۔

"میں آپ کی تصویر تیار کر دوں گی" دوشیزہ بولی "مگر شرط یہ ہوگی آپ کو statue بننا ہوگا"

"مجھے کوئی عذر نہیں" عابد نے کہا۔

"اچھا! کھڑے ہو جائیے اگر دن گھمائیے...... دریا کی طرف دیکھئے" لڑکی نے کہا "اسی عالم میں رہیئے جب تک کہ میں آپ سے خود نہ کہدوں"

"تو کیا آپ کی طرف سے بھی نہیں دیکھ سکتا" عابد نے پوچھا۔

"نہیں، تصویر خراب ہو جائے گی" وہ بولی۔

"بہت بہتر، جیسا حکم ہو" عابد دریا کی طرف منہ کرتے ہوئے بولا"

اس درمیان میں عابد کے دل میں نئے نئے خیالات پیدا ہو چکے تھے،

وہ یہ غور کر رہا تھا کہ اس کی زندگی کس طرح گذرتی ہو گی؟ اس کے کون کون سے دوست ہوں گے؟ مگر وہ دریا کی طرف منہ اٹھائے رہا، دس منٹ گذر گئے...... عابد کی گردن میں درد ہونے لگا، اس کی رگیں تننے لگیں، اس کی گردن نیچے کو جھکنے لگی، یکایک اس کی گردن گھوم گئی، اس نے دیکھا کہ دوشیزہ اپنے کام میں خاموشی کے ساتھ مشغول ہے۔ عابد یہ کہتا ہوا بڑھا ؎

اے مصور تیرے ہاتھوں کی بلائیں لیلوں
خوب تصویر بنائی تو نے میرے بہلانے کو

"وہیں کھڑے رہیے اور اسی حالت میں" لڑکی نے گرج کر کہا۔
"بہت خوب" عابد کی زبان سے نکلا۔
"ادھر نہ دیکھئے" لڑکی بولی۔

عابد اسی حالت میں کھڑا ہو گیا مگر دوشیزہ نے یکایک اپنی جگہ چھوڑ دی اور آبادی کی راہ لی، تھوڑی دیر میں وہ دور نکل گئی، سڑک پہ پہنچکر وہ ایک گلی میں گھس گئی، عابد نے جو رخ بدلا تو دوشیزہ کو نہ پایا۔ نگاہوں نے پیچھا کیا تو اس کو گلی میں مڑتے ہوئے دیکھا، وہ فوراً اس کے تعاقب میں روانہ ہوتا مگر اس نے سوچا کہ اس کا سامان بھی لے چلنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ان کو لے جائے" اس خیال کے ساتھ ہی عابد نے مصوری کا تمام سامان اکٹھا کیا اور اس کو لیکر دوڑنے لگا، ایک جانب سے ایک شخص چلاتا ہوا آیا۔

"اس کو پکڑ لینا میرا سامان لے کر بھاگا جاتا ہے۔"
مگر دوسری جانب سے بدھو بھاگا ہوا آیا "میرے کپڑے لیے جا رہا ہے اس کو پکڑ لینا۔"
یہ آوازیں عابد کے کانوں میں پہنچیں، وہ گھبرا گیا اور تیزی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہی دوشیزہ ایک مکان میں داخل ہوئی اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔ عابد بھی وہیں پہنچا، تمام سامان زمین پر رکھ کر کنڈی ہلانا ہی چاہتا تھا کہ وہی دوشیزہ سرخ ساری پہنے برآمد ہوئی اور بولی۔
"تم چلے جاؤ...... خدا کے واسطے...... فوراً چلے جاؤ" دوشیزہ نے التجا کرتے ہوئے کہا۔
"ہم دونوں پھر ایک جگہ ہو گئے" عابد بولا "میں آپ کے اوزار بھی لے آیا ہوں۔"
"چلے جاؤ، بھاگ جاؤ" تمہاری خیر اسی میں ہے "تم ان اوزاروں کو وہیں رکھ آؤ، جاؤ جاؤ" دوشیزہ نے دوبارہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔
عابد نے دروازہ کی دراز سے منہ لگا کر کہا "یہ آپ ہی کی چیزیں ہیں ان کو یہیں رکھ لیجئے میں لے آیا ہوں۔"
اندر ہی سے دوشیزہ نے چلا کر کہا "چلے جاؤ —— چلے جاؤ..... ان کو وہیں رکھ آؤ...... گئے نا؟"

"نہیں، ابھی نہیں" عابد نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اُن کو واپس لے جاؤں، آپ کی چیزیں آپ کے حوالے، آپ جائیں اور آپ کا کام۔"

"نہیں، نہیں، ضرور چلے جاؤ اور ان کو وہیں رکھ آؤ" اندر سے آواز آئی۔

"اس قدر گھبرانے کی ضرورت کیا ہے؟" عابد نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

"میری خوشی یہی ہے کہ تم ان کو وہیں رکھ آؤ" اندر سے کانپتی ہوئی آواز آئی۔

عابد نے جونہی قدم بڑھایا وہ سُرخ ساری پہنے پھر باہر نکل آئی اور بولی۔

"جاؤ سامنے والی گلی سے نکل جاؤ، ان کو وہیں رکھ آؤ، تب میں تم کو سب ماجرا بتاؤں گی۔"

عابد کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ اُس نے دوبارہ دروازہ بند کر لیا۔

عابد بتائی ہوئی گلی سے گزر ہی رہا تھا کہ دو تین شخص معہ ایک سپاہی کے پہنچے اور دروازہ پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور وہی دوشیزہ باہر نکل آئی۔

"آپ لوگوں نے کیسے زحمت کی؟" لڑکی نے پوچھا۔

"اُس بدمعاش کو نکالو، کہاں چھپا رکھا ہے، وہ میرے کپڑے لیکر

بھاگ آیا ہے" بدھو دھوبی نے گرم ہو کر کہا۔

"اور وہ میرے مصوری کے اوزار لے کر آیا ہے" دوسرا شخص بھاری آواز میں بولا۔

"تم جھوٹے ہو" دوشیزہ کڑک کر بولی "وہ یہاں نہیں ہے۔ تمھارے آلات اُسی جگہ میدان میں موجود ہیں، جا کر اُن کو اُٹھا لو"

"وہاں کچھ بھی نہیں ہے" دوسرا شخص بولا۔

"بکواس مت کرو" دوشیزہ نے بگڑ کر کہا "جاؤ اپنا سامان دیکھ آؤ"

"اور میرے کپڑے" بدھو نے کہا۔

"تم ٹھیرو" لڑکی بولی "وہ ابھی آنے ہوں گے"

"یہ دونوں چور ہیں" بدھو نے سپاہی سے کہا۔

یہ الفاظ پورے طور پہ بدھو کی زبان سے ادا بھی نہ ہونے پائے تھے کہ عابد دوبارہ وہیں پہنچ گیا۔

"میں چور ہو سکتا ہوں" عابد نے کہا "ان کو تم الزام نہیں دے سکتے! مگر میرے کپڑے بھی تمھارے یہاں موجود ہیں"

"ہاں تو آپ اپنے کپڑے لے لیجئے۔ یہ گاہک کا مال ہے ان کو دیدیجئے" بدھو نے کہا۔

فوراً ہی دوشیزہ نے عابد کو ایک جوڑا نکال کر دیا، عابد نے اُس کو پہنا اور بدھو کے کپڑے اُس کے حوالے کر دئے، بدھو اور

سپاہی واپس ہونے والے تھے کہ عابد نے پھر کہا "میرے کپڑے بھجوا دینا۔"

"بہت اچھا" بدھو بولا۔

جیسے ہی بدھو گیا، دوشیزہ عابد کو اپنے رنگین گول کمرے میں لے گئی اور بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ عابد بیٹھ گیا اور یوں بولا۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ وہاں کیوں بیٹھی تھیں اور یہ کس کے آلات تھے اور آپ میری تصویر کھینچتے کھینچتے کیوں بھاگ کھڑی ہوئیں؟ عابد نے استفسارانہ انداز میں کہا۔

دوشیزہ مسکرائی اور بولی "میرے خیال میں آپ کو کافی سزا مل چکی ہے۔"

"یقیناً" عابد نے کہا "میں حیران ہوں کہ یہ کیا قصہ تھا۔"

"حیران اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو اس کی سزا دینا چاہتی تھی کہ آپ نے ایک نامحرم لڑکی کو اپنی طرف کیوں رجوع کیا؟" دوشیزہ بولی۔

"کیا یہ بھی کوئی جرم ہے؟" عابد نے پوچھا۔

"یقیناً" دوشیزہ نے کہا "آپ آئندہ کبھی کسی لڑکی کو تنہا پاکر مخاطب نہ کریں۔"

"میں نے تو بھولی بھالی دوشیزہ سمجھ کر تنہائی دور کرنے کا خیال کیا تھا" عابد نے کہا۔

"مگر بھولی بھالی لڑکی ایک چالاک مرد کو پھنسا سکتی ہے" دوشیزہ نے کہا۔

"تجربہ تو ایسا ہی ہوا ہے" عابد بولا "مگر مجھ کو یقین نہیں ہوتا کہ یہ مجھ کو سزا دی گئی ہے۔"

"بے شک وہ سزا دی گئی تھی" دوشیزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں مصور کے سامان کی حفاظت کر رہی تھی، میں اس کو آتے دیکھ کر سمجھ گئی، مجھے یہ خیال تھا کہ آپ ضرور سامان لے کر آئیں گے اور وہ آپ کا پیچھا کرے گا۔"

"یہی ہوا بھی" عابد نے کہا "مگر یہ تجربہ اچھا ہوا۔"

"آیندہ احتیاط" دوشیزہ نے کہا۔

"مگر اب ممکن نہیں" عابد نے کہا "آپ کی ملاقات نے ہمت بڑھا دی۔"

"نہیں، نہیں" دوشیزہ نے کہا "اب اس کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔"

عابد نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اور ان کو زور زور سے دبانا شروع کیا۔ دوشیزہ کی سانسیں زور زور

سے چلنے لگی۔
عابد کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ سی محسوس ہوئی، دونوں
کی نگاہیں اوپر اٹھیں اور اس طرح کہ نگاہوں ہی نگاہوں
میں آیندہ کا پروگرام بھی بنا لیا۔

تصادم

ارشد محبت کا قائل تھا اور دل سے محبت کے جذبات کی قدر کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک قدرتی جذبہ ہے جو انسان کے دل میں بااختیار خود پیدا ہوتا ہے۔ اُسے ایسی محبت کے ذکر پر ہنسی آتی تھی جو نظروں کے صرف ایک ہلکے سے تصادم سے دلوں پر بجلیاں گراکر زندگی کی پُرسکون ساعتوں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

لیکن آج وہ اپنے خیالات پر نادم تھا اور خاموش۔ شمع کو اس نے صرف ایک نظر دیکھا تھا، مگر اُس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ بے چین تھا اُس کی یادیں۔

شمع کو ارشد کے احساسات کا کوئی علم نہ تھا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ چند ہی دنوں سے ارشد کے پڑوس میں آکر

رہی تھی اور صرف ایک ہی روز اپنی ماں کے ساتھ ارشد کی والدہ
سے ملنے آئی تھی۔
ارشد جانتا تھا کہ اب شمع برابر اُس کے یہاں آئے گی۔ مگر
وہ نہیں چاہتا تھا کہ حال دل اُس کی زبان پر آئے کیونکہ وہ
اظہار محبت کو موت کے مترادف سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ محبت
ایک لامتناہی سفر ہے اور جس کی کوئی منزل نہیں۔ انسان
محبت کے راستہ میں تھک کر فنا ہو جاتا ہے۔ مگر منزل کا نشان
نہیں پاتا۔
فی الحقیقت محبت میں ایسی مقناطیسی کشش ہوتی ہے جو آدمی
کو احساس ناکامی اور ہلاکتوں کے باوجود بھی نامعلوم منزل کی طرف
کھینچ لاتی ہے۔ ارشد بھی بے اختیار کھنچا جا رہا تھا۔ شمع کا خیال
موت کی سی بے چینیاں اس پر طاری کئے ہوئے تھا۔

ایک دن صبح کو ارشد اپنے مکان کی بالائی منزل پر دھوپ
میں بیٹھا ناول کا مطالعہ کر رہا تھا۔ نہایت محویت کے عالم میں کھویا
ہوا سا۔ یکایک شمع کے سُریلے قہقہے نے اُس کے دل میں تڑپ
تڑپ پیدا کر دی۔ پُرشوق نگاہیں نیچے صحن کی طرف کھنچ گئیں،
جہاں وہ بیٹھی ارشد کی بہن صفیہ سے خوش گپیاں کر رہی
تھی۔

اُف! کتنی حسین تھی وہ۔ اور کس قدر بھولی۔ سیاہ مسکراتی ہوئی۔ آنکھوں میں خمار کی دنیا سمٹ کر آ گئی تھی۔ ارشد کی نظریں اُس کے حسن کی لطافتوں پر جم کر رہ گئیں گویا ارمانوں کا ہجوم ان میں سما گیا تھا۔ یکایک شمع کی نظریں بھی ارشد کی طرف اُٹھ گئیں۔ اور ارشد کی محویت کے تار ٹوٹ کر رہ گئے۔ اُس نے خفیف ہو کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ شمع بھی لجا گئی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جس نے ارشد کے سینے میں آگ سی لگا دی۔ بیقراری کا طوفان اُٹھا دیا۔

وہ اُٹھ کر اپنے کمرہ میں آ گیا اور کھو گیا کیفیت کے ہجوم میں۔ مست و بیخود۔ شمع کی مسکراہٹ نے گویا اس کے مُردہ جسم میں تازہ روح ڈال دی۔ اُس نے سوچا اور سوچتا رہا کئی دن کہ آخر شمع کی حجاب آلود نگاہیں اُس کی طرف کیوں اُٹھ رہی تھیں۔ کیا وہ بھی اُسے پسند آ گیا تھا۔ کیا اس کی محبت کی تڑپ نے شمع کے دل پر بھی اثر کر دیا تھا اور وہ بھی اُس کی طرف مائل تھی۔

کئی دن اِس اُلجھن میں گذر گئے مگر ارشد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کاش اُسے شمع سے ملنے اور بات کرنے کا موقع مل سکتا اور وہ اپنی روداد محبت ظاہر کر کے اپنے قلبی انتشار کا درماں کر سکتا۔

کئی دن بعد ایک روز جب ارشد مکان میں نہ تھا، شمع نے

اُس کی لائبریری دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور صفیہ اُسے ارشد کے کمرے میں لے گئی سامنے میز پر ناول "بھینٹ" رکھی تھی۔ شمع اُسے اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ صفیہ نے کہا "شمع! یہ ناول بھائی جان کو بہت پسند ہے۔ ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔ دسیوں مرتبہ تو ختم کر چکے ہوں گے۔"

"ایسی کیا خوبی ہے اس میں؟" شمع نے سوال کیا۔

صفیہ نے کہا "محبت و ایثار کی بے نظیر داستان ہے۔ رسم و رواج کی چوکھٹ پر دو دلوں کو غم فراق گھن کی طرح کھا گیا۔ مگر اُف رے ضبط، مٹتے رہے مگر مسکراتے ہی رہے دونوں۔ اور ہاں! ڈاکٹر حکمت اللہ خاں الہ آباد میں ہمارے ہی پڑوس میں محلہ چک پر رہتے ہیں۔"

شمع کی آنکھوں میں شوخی چمک اُٹھی "معلوم ہوتا ہے تمہارے بھائی جان کسی کی محبت میں گرفتار ہیں اور اُنھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اسی لئے غم میں مٹی ہوئی جوانیوں کی کہانی سے ضبط کا حوصلہ بڑھاتے رہتے ہیں!!"

"مجھے کیا معلوم" صفیہ نے شرماتے ہوئے لہجہ میں کہا "اب تو تم سے ان کا پردہ نہیں ہے۔ خود پوچھ لونا۔"

"خیر میں ناول لئے جاتی ہوں اور پڑھ کر اس میں آگ لگا دوں گی تاکہ ان کا ضبط دور ہو جائے۔ امتحان سر پر ہے اور ناول سے دل لگائے بیٹھے ہیں۔"

صفیہ معنی خیز نظروں سے شمع کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ اور شمع نے

کتاب بغل میں دبالی۔

جب ارشد شام کو کالج سے واپس آیا اور صفیہ سے ناول کے بارے میں دریافت کیا تو صفیہ نے شمع کے کہے ہوئے الفاظ دھرا دئے۔ ارشد خاموش ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے دل پر ایک عجیب کیفیت سی طاری ہو گئی تھی۔ رگ رگ میں مسرت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ پھول کی پنکھڑیوں میں چھپی ہوئی خوشبو سونگھی جا سکتی ہے دیکھی نہیں جا سکتی۔ اسی طرح شمع کی باتوں میں محبت کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش اس کا خیال صحیح ہو اور شمع محبت کی انگڑائیوں کو اس سے چھپا کر نہ رکھے۔ وہ بیتاب تھا شمع کی زبان سے یہ سننے کے لئے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔

ارشد بھی کس قدر بھولا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ شمع شرم و حیا کے ماحول میں پرورش پائی ہوئی نوعمر لڑکی تھی وہ بھلا کس طرح اپنی محبت کا اعتراف کر سکتی تھی۔ لیکن ارشد گھنٹوں اپنے خیال میں کھویا رہا اور سوچتا رہا کہ کس طرح شمع کے احساسات کا پتہ لگائے۔ آخر شام ہو گئی اور وہ گھبرا کر باہر نکل آیا شمع صحن میں بیٹھی تھی اور صفیہ کمرے میں کشیدہ کاری کے کچھ نمونے تلاش کر رہی تھی۔

شمع نے شرمائی ہوئی نظروں سے ارشد کو دیکھا۔ ارشد نے کہا "کہیئے آپ نے ناول بھینٹ" کو آگ کے نذر کر دیا"

"کیا مطلب؟" شمع نے مصنوعی استعجاب سے کہا۔

ارشد نے کہا "آپ نے فرمایا تھا تاکہ پڑھ کر اسے جلا دیں گی"
یہ میرے اور صفیہ کے درمیان کی گفتگو ہے۔ میں نے اس سے مذاق
کیا تھا" شمع نے کہا "ہاں اپنی غلطی کے لئے ضرور ندامت محسوس
کر رہی ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی کتاب لے گئی"
ارشد بول اٹھا "نہیں نہیں ندامت کی کیا بات ہے۔ میرے پاس
ناولوں کا ذخیرہ ہے۔ آپ شوق سے انھیں لے سکتی ہیں"
شمع نے کہا "مجھے ناولوں سے کوئی دلچسپی نہیں "بھینٹ" میں اپنی ایک
سہیلی کے لئے لے گئی ہوں جسے اس کی تلاش تھی۔ پڑھ لے گی تو واپس
کر دوں گی۔
اسیر ارشد نے محسوس کیا کہ اس نے شمع سے گفتگو کرنے کا غلط
بہانہ تلاش کیا۔ شمع کے جواب سے اس کے دل پر گہری چوٹ لگی، اس کی
آرزوؤں کے محل مسمار ہو کر رہ گئے"
اتنے میں صفیہ آگئی اور شمع جانے کے لئے تیار ہو گئی۔
"آپ جا رہی ہیں؟" ارشد بول اٹھا۔
"جی ہاں" شمع نے جواب دیا۔
"ذرا اور بیٹھیے نا۔ چائے پی کر جائیے گا" ارشد نے کہا۔
"کیا آپ دل سے کہہ رہے ہیں؟" شمع نے شوخ لہجہ میں کہا۔
"آپ کو شبہہ ہے کیا؟" ارشد نے سوال کیا۔
"ضرور" شمع بولی "اتنی دیر سے بیٹھی ہوں۔ اگر چائے پلانی تھی تو

اب تک پلادی ہوتی۔"

ارشد کسی قدر خفیف ہو گیا "دراصل چائے کا وقت نہیں تھا۔"

شمع بے اختیار ہنس دی۔ "تو اب بھی وقت کہاں ہے؟"

ارشد اور خفیف ہو گیا۔ شمع اٹھ کر چلی گئی۔

~~~~~~~~

اب شمع تقریباً ہر روز صفیہ سے ملنے آتی تھی۔ ارشد کی آرزو تھی کہ وہ اس کے کمرے میں بھی آئے۔ بیٹھے اور اس سے باتیں کرے۔۔۔ بے تکلف اور جذباتی۔ مگر اس کی یہ تمنا کبھی نہ پوری ہوئی۔ شمع صفیہ سے خوش گپیاں کر کے چلی جاتی تھی اور ارشد غم کے ہجوم میں آہ کیے جاتا تھا۔ اتنے دنوں میں شاید ہی کسی دن وہ شمع سے کچھ باتیں کر سکا ہو۔

دلفریب اور حسین چاندنی راتیں تھیں۔ شمع اور صفیہ نے اپنی دو ایک اور سہیلیوں کے ساتھ دریا کی سیر کا پروگرام بنایا۔ اور اس خیال سے کہ کوئی مرد ہمراہ ہونا چاہئے ارشد کو بھی پروگرام میں شامل کر لیا۔ لڑکیوں کے ساتھ ارشد کو کوئی دلچسپی تو ہو نہ سکتی تھی مگر اس امید میں کہ ممکن ہے شمع سے اظہار محبت کا موقع مل جائے، وہ ان کے ساتھ ہو لیا۔

چاند اپنی پوری رعنائیوں اور دلکشی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ قریب کے پارک اور باغوں سے اڑ اڑ کر آنے والی خوشبو سے ساری فضا مہک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے دلوں میں امنگیں
~~~~~~~~

پیدا کر رہے تھے۔ لڑکیاں ساحل دریا پر قدرت کے دلفریب نظاروں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ ہنستی اور دوڑتی پھر رہی تھیں۔

یکایک شمع ٹھہر گئی اور انتہائی محویت کے عالم میں سطح دریا پر موجوں کو رقصاں دیکھنے لگی۔ ارشد بھی موقع پا کر اس کے قریب آ گیا مگر وہ خاموش نظریں جمائے لہروں کی دلکش اور مستی بھری اٹکھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔

ارشد نے آخر اسے اپنی طرف مخاطب کیا۔ "کتنی حسین چاندنی ہے۔ کیسی دلفریب فضا ہے۔"

شمع کی نگاہیں دریا کی سطح سے ہٹ کر ارشد کے چہرہ پر آ گئیں۔

"جی ہاں ہے تو۔"

کتنا مختصر جواب تھا۔ مگر جذبات میں ڈوبا ہوا۔ ارشد کی رگوں میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ "کاش انسان کی زندگی ایسی دلفریب ساعتوں سے برابر گھری رہے۔"

"مگر ایسی گھڑیاں کم نصیب ہوتی ہیں۔ ایسی حسین راتیں بھی کم میسّر آتی ہیں۔" شمع نے جواب دیا۔

ارشد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کاش میری تمام زندگی ایسی رنگین رات بن جائے۔"

"خدا سے دعا کیجئے۔" شمع نے کہا اور آگے بڑھ کر صفیہ وغیرہ کے ساتھ ہو لی۔"

پیدا کر رہے تھے۔ لڑکیاں ساحل دریا پر قدرت کے دلفریب نظاروں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ ہنستی اور دوڑتی پھر رہی تھیں۔

یکایک شمع ٹھہر گئی اور انتہائی محویت کے عالم میں سطح دریا پر موجوں کو رقصاں دیکھنے لگی۔ ارشد بھی موقع پا کر اس کے قریب آ گیا مگر وہ خاموش نظریں جمائے لہروں کی دلکش اور مستی بھری اٹھکھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ ارشد نے آخر اسے اپنی طرف مخاطب کیا۔ "کتنی حسین چاندنی ہے کیسی دلفریب فضا ہے۔"

شمع کی نگاہیں دریا کی سطح سے ہٹ کر ارشد کے چہرہ پر آ گئیں۔

"جی ہاں ہے تو۔"

کتنا مختصر جواب تھا۔ مگر جذبات میں ڈوبا ہوا۔ ارشد کی رگوں میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ "کاش انسان کی زندگی ایسی دلفریب ساعتوں سے برابر گھری رہے۔"

"مگر ایسی گھڑیاں کم نصیب ہوتی ہیں۔ ایسی حسین راتیں بھی کم میسّر آتی ہیں۔" شمع نے جواب دیا۔

ارشد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کاش میری تمام زندگی ایسی رنگین رات بن جائے۔"

"خدا سے دعا کیجئے۔" شمع نے کہا اور آگے بڑھ کر صفیہ وغیرہ کے ساتھ ہو لی۔"

ارشد دل مسوس کر رہ گیا شمع کی بے حسی پر۔

ایک روز شام کو شمع اور صفیہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ ارشد مکان میں داخل ہوا۔ آج اسے کالج میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ شمع نے اسے دیکھ کر ایک عجیب انداز میں کہا "اوہو۔ آج اتنی شام کو آپ کا کالج ختم ہوا۔

"جی" ارشد نے جواب دیا۔ سبق نہیں یاد تھا اس لئے دیر میں چھٹی ملی ہے"

اس پر صفیہ اور شمع دونوں ہنس دیں۔ شمع نے کہا "مگر آپ کھیل و تفریح میں اتنا زیادہ وقت کیوں خراب کرتے ہیں"

ارشد نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ شمع کا لہجہ اسے خشک معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے دماغ پر وحشت سی طاری ہو گئی وہ سوچنے لگا کہ شمع انتہائی بے حس ہے۔ اب میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا اسے جانا ہی پڑا۔ اور اسی وقت۔ شمع اس کی زندگی تھی اور وہ اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا"

صفیہ چائے لینے گئی تھی اور شمع تنہا بیٹھی اپنے دوپٹہ کے آنچل کو انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ ارشد کو دیکھ اس کے چہرے پر شرم آلود تبسم لہرا گیا۔

"صفیہ کہاں ہے؟" ارشد نے پوچھا۔

"چائے لینے گئی ہیں" شمع نے جواب دیا۔

"تو آیئے کمرے میں چلیں۔ وہاں چائے آجائے گی" ارشد چاہتا تھا کہ شمع اس کے کمرے میں چلے اور وہ اس سے کچھ باتیں کرسکے۔ مگر شمع نے بہانا کر دیا "یہاں ٹھیک ہے۔ کمرے میں گرمی ہوگی"

ارشد نے پھر ترغیب دیتے ہوئے کہا "برقی پنکھا کھول دیں گے۔ دراصل مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہے"

"باتیں تو آپ یہاں بھی کرسکتے ہیں" شمع نے بے فکرانہ انداز میں کہا۔

ارشد نے کہا "دراصل آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے۔ ضروری مشورہ"

شمع پھر اسی انداز میں بولی "تو پھر کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی رکھئے۔ کیونکہ مجھے ابھی اپنی ایک سہیلی کے یہاں جانا ہے"

اتنے میں صفیہ چائے لے کر آگئی اور باتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

اس کے بعد کئی دن تک ارشد اور شمع کی باتیں نہیں ہوئیں۔ ارشد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر شمع کس فطرت کی لڑکی ہے۔ وہ ایک ایسے دل کو ٹھکرا رہی تھی جو اس کی یاد میں مٹا جا رہا تھا۔

"جو دل محبت کے سچے جذبات کی قدر نہ کرسکے وہ دل نہیں پتھر ہے"

شروع میں تو ارشد یہ سوچتا رہا کہ شمع شاید اُس کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور قبل اس کے کہ وہ اپنی محبت کا اظہار کرے یہ یقین کرنا چاہتی ہے کہ کیا واقعی ارشد کے دل میں غیر فانی محبت پرورش پا چکی ہے۔ مگر اب وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ شمع اُس کے لئے غیر احساس دل رکھتی ہے۔ اور اس کی طرف نظر التفات نہیں کرنا چاہتی۔ اور اسی لئے اب ارشد اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔ ایک ایسی تڑپ سی پا رہا تھا اپنے سینہ میں جو اس کے تنفس کے تاروں کو توڑے دے رہی تھی۔

اف۔ وہ بھیانک غم و فکر کے طوفان میں گھرا ہوا تھا۔ کوئی اس کا ایسا ہمراز بھی نہ تھا جو اس کے دل کو ڈھارس بندھاتا اور صبر و سکون کی ترغیب دیتا۔

اب جب شمع اس کے سامنے آتی تھی تو اُس کے دل میں غمناک دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ اور وہ مایوسیوں کے ہجوم میں کھو کر رہ جاتا تھا وہ سوچنے لگتا کہ کاش شمع کے دل میں بھی محبت کی خلش بے چینیاں پیدا کر دے اور وہ اس کے سامنے اعتراف شکست کر کے اُس کی آغوش تمنا میں آجائے۔ مگر ارشد کا یہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا تھا۔ شمع گویا حسن کی ملکہ تھی مغرور ملکہ، جس کے ارادے مستحکم تھے اور جو ارشد کی آغوش محبت میں آنا تو در کنار اُس کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھا سکتی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ ارشد اپنے کمرے میں غم میں ڈوبا ہوا پڑا تھا کہ شمع اور صفیہ تانگے سے اُتریں۔ وہ اپنی سہیلی کے یہاں سے آئی تھیں۔ دونوں باتیں کرتی مکان میں داخل ہوئیں۔ اور ارشد کے کمرے کے برابر کے کمرے میں بیٹھ گئیں۔ شمع نے کہا۔
"آج سارا دن ارشد صاحب نظر نہیں آئے؟"
شمع کی زبان سے اپنا نام و ذکر سُن کر ارشد کو حیرت آمیز خوشی ہوئی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔
صفیہ نے کہا "ہاں۔ آج وہ کالج نہیں گئے اور اپنے کمرے سے باہر نہیں آئے۔"
ارشد اس امنگ میں اپنا سارا غم بھول گیا کہ شاید شمع کا دل اُس کی طرف مائل ہو گیا اور وہ اسی لئے اس کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے۔ مگر فوراً شمع نے بات کا پہلو بدل دیا اور موسم کی دل کشی اور دوسری باتوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ارشد کے خیالات کا خوشگوار سلسلہ پھر ٹوٹ کر رہ گیا۔
صفیہ نے پھر کہا "شمع! تم بھائی جان سے انگریزی کیوں نہیں پڑھ لیتی ہو۔ ساری کمزوری دور ہو جائے گی۔"
بھلا شمع کب ارشد کے پاس بیٹھ کر مدد لے سکتی تھی۔ اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "اللہ مالک ہے پاس ہو جاؤں گی۔"
اُف! شمع کا دل کتنا سخت تھا۔ وہ کس اطمینان سے جور و جفا

کے سلوک پر آمادہ تھی اور ارشد بے رُخی کی چوٹیں سہتے سہتے بیدم ہوا جا رہا تھا۔

معاً ارشد کے دل میں آیا کہ وہ شمع کے پاس پہونچکر اُس کی سنگ دلی پر حقارت آمیز قہقہوں کی ایسی چوٹیں کرے کہ وہ غم و ندامت سے نظر نہ اُٹھا سکے۔ مگر محبوب کو نادم کرنا عاشق کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اُسے پھر خیال آ گیا "محبت کرنے کی چیز نہیں، ہو جانے والی شے ہے" انسان کے خیالات اور احساسات خریدے نہیں جا سکتے۔

ارشد غم و غصہ کے ہلاک کن طوفان کو دل میں دبا کر رہ گیا۔ سوچنے لگا۔ محبت سے زیادہ محبت کے ایثار کی قدر ہے۔ اگر اس کی محبت پاک اور سچی ہے تو ناکامی کی اور بربادی کی ٹھیس اُسے مجروح نہیں کر سکتی۔

یہ ہی نہیں کہ شمع ارشد کے ساتھ تغافل برتتی تھی۔ یا اس کی باتوں میں دلچسپی نہ لیتی تھی۔ بلکہ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اُس کی باتوں کو رد کر دینے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ نہ معلوم کیوں۔ کس جذبہ کے ماتحت۔

ایک روز ارشد نے سینما کا پروگرام پیش کیا۔ حالانکہ شمع کو سینما سے عشق سا تھا، مگر اُس نے ارشد کے پیش کردہ پروگرام کو یہ کہہ کر ٹال دیا۔ "مجھے فرصت نہیں ہے۔ گھر میں مہمان آنیوالے

ہیں۔" اور ارشد رنجیدہ ہو کر رہ گیا۔

دن گذرتے گئے۔ ارشد کے دل میں چنگاریاں شعلے بن کر بھڑکنے لگیں۔ مگر شمع بدستور بے حس اور خاموش تھی۔
اسی درمیان میں صفیہ کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گھر میں ارشد کی شادی کا بھی ذکر چھڑ گیا۔ ارشد کے دل پر یہ تازہ چوٹ تھی۔ وہ شمع سے محبت کر کے اب اس کے لئے جی رہا تھا۔ وہ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا تھا۔ شادی کا خیال اس کے لئے سوہان روح بن گیا۔ بے چینی کی نئی کروٹ نے جان پر بنا دی مگر اب بھی شمع کے طرز عمل میں کوئی فرق نہ آیا وہ ہی تغافل رہا اور وہ ہی بے رخی۔
ارشد سمجھ چکا تھا کہ شمع اس سے محبت نہیں کر سکتی۔ شاید قدرت نے اس کے دل میں محبت کا جذبہ پیدا ہی نہیں کیا۔۔۔۔
شمع کئی دن سے ارشد کے یہاں نہیں آئی تھی۔ نہ معلوم کیوں۔ ارشد کا دل غم سے پھٹ رہا تھا۔ گویا زندگی کی سانسوں کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔
سہ پہر کا وقت تھا۔ گھر میں سب لوگ آرام کر رہے تھے۔ ارشد ناکام آہوں کے ساتھ ناول دیکھ رہا تھا کہ شمع اس کے کمرے میں داخل ہوئی کمھلائی ہوئی سی اور افسردہ۔ ارشد کے دل کی

دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ اس وقت کیا محسوس کر رہا تھا خود نہیں بتا سکتا تھا۔ اُس کی حیران نگاہیں شمع پر جمی تھیں۔ وہ خاموش تھا اور ساکت۔

شمع کا حال بھی عجیب تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرا مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھیں سُرخ تھیں اور متورم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دن سے رو رہی ہے اور کئی راتیں آنکھوں میں کاٹ چکی ہے۔

"آپ میرے اس طرح آنے سے ناخوش تو نہیں ہیں؟" شمع نے نحیف آواز میں کہا۔

"ہرگز نہیں، بیٹھیو" شمع کے سوال نے گویا۔ ارشد کی زبان میں قوت گویائی پیدا کر دی۔

"ایک بات پوچھوں؟" شمع نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ضرور" ارشد کا دل تڑپ اُٹھا۔

مگر شمع کچھ نہ کہہ سکی۔ جیسے یکایک اُس کی زبان پر فالج گر گیا ہو۔

"کہئے نا۔ کیا بات ہے؟" ارشد نے پھر کہا۔

"آپ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں" شمع نے نظریں فرش پر گڑوتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ارشد بے چین ہو گیا۔ ارشد نے کبھی شمع کو افسردہ نہ دیکھا تھا۔ آج اس کے سینہ میں غم کی بھٹیاں جل رہی تھیں۔

"یہ پوچھ کر کیا کرو گی شمع؟" ارشد نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں" شمع کی آنکھوں سے آنسو کا دریا اُبل پڑا۔

ارشد کے سینے میں جیسے کسی نے خنجر پیوست کر دیا۔ آنکھیں رو پڑیں اور وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کرسی کے تکیہ سے ٹک گیا۔

"مگر تم کو کیوں غم ہے شمع۔؟"

"بتلانے ہی پر سمجھ سکیں گے کیا آپ" شمع ڈوپٹہ کے آنچل سے آنسو خشک کرنے لگی۔

"مگر تمھاری تمام خاموشیاں اور تغافل؟" ارشد سوال کر بیٹھا۔

"نسوانی شرم و حجاب کے ساتھ جذبۂ خودداری کا نتیجہ تھیں ارشد" شمع بولی "کیا آپ شادی کے رضامند ہیں"

"میری زندگی کی مسرتوں کی تباہیاں تمھیں کیا بتاتی ہیں شمع" ارشد نے غمگیں لہجہ میں کہا۔

"یہی کہ آپ میرے ہیں صرف میرے" شمع بے اختیار کہہ گئی۔

ارشد جذبات محبت سے بے خود ہو گیا اور اس نے بڑھ کر شمع کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

"سچ ہے شمع۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں رکھ سکتی محبت کی شکل میں زندگی کی ساری خوشیاں آج سمٹ کر آگئی ہیں"

دونوں خوشی کے نشہ میں بے خود ہو گئے۔ دنیا سے بے خبر۔

"انجم! کالج کا وقت ہو گیا اور تم افسانہ نگاری میں مصروف ہو"
نرگس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی جیسے انجم کا دل بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت ناول کی تیاری میں اپنی تمام تر قوت تخیل اور مشاہدات صرف کر رہی تھی دنیا سے بے خبر انتہائی انہماک کے عالم میں وہ ناول کو چھوڑ کر کالج کی تیاری کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"نرگس کاش کالج سے کبھی چھٹی بھی مل جاتی۔ میرا تو جی گھبرا گیا ہے۔ کاش چند دنوں کے لیے کالج بند ہو جائے تو میں ناول مکمل کر لوں"

"بلی کے نصیب سے چھینکا ٹوٹا" نرگس نے کہا "تو گھبراؤ نہیں تعلیمی کمیشن کی جدید اسکیم کے خلاف طلبہ علم بغاوت بلند کرنے والے ہیں۔ شہر میں کئی دن مکمل ہڑتال رہے گی۔ اسکول اور کالج بھی بند

کرائے جائیں گے۔

"ہاں یہ تو میں نے بھی سنا ہے" انجم نے بے دلی سے کہا "مگر تم کب مانو گی کالج جائے بغیر پیکٹنگ کرنے والوں کے سینے پر چڑھ کر دعویٰ رکھتی ہو۔ اور پچھلی مرتبہ گئی نہیں ہو گیا"

"نرگس ہنس دی۔ تو تم نہ جانا"

انجم جیسے جھنجھلا گئی "نرگس شرم نہیں آتی تم کو یہ کہتے ہوئے۔ اگر تمہارے بغیر گھر پہ ٹھہر سکتی تو کیا چند دن کی رخصت نہیں لے سکتی تھی"

"نرگس نے بڑھ کر انجم کے گلے میں باہیں ڈال دیں" اچھا ناخوش نہ ہو میرے مجنوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں اس مرتبہ کالج نہ جاؤں گی"

"اچھی نرگس بس تو میری ناول مکمل ہو جائے گی" انجم نے خوشی میں جھوم کر کہا "انشاءاللہ۔ میری یہ ناول دنیائے ادب میں ستارہ بن کر چمکے گی"

"آمین! نرگس نے کہا" اور میں اسے اپنے ماتھے کی بندیا بناؤں گی۔ کیوں؟ بنانے دو گی نا؟"

انجم بولی "جب میں تمہاری ہوں تو میری ہر چیز تمہاری ہے"

نقرئی قہقہے کمرہ کی فضا میں گونج گئے۔

انجم کی زندگی کی ساری دلچسپیاں نرگس اور ناول نگاری میں

تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے دونوں ہی سے گویا عشق تھا۔ اُسے نہ تو نرگس کے بغیر ایک پل چین آتا تھا اور نہ افسانہ نگاری سے دل ہٹتا تھا۔

نرگس بھی انجم کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتی تھی۔ اور ایک لمحہ بھی اُس سے دور نہ رہ سکتی تھی۔ دونوں سہیلیاں ایک روح دو قالب ہو رہی تھیں۔

پکیٹنگ شباب پر تھی۔ والنٹیر کالج اور اسکولوں کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ جونہی انجم اور نرگس کالج کے دروازہ پر پہونچی ایک خوشرو نوجوان ہاتھ جوڑ کر کار کے سامنے آگیا" بھوکے بچوں کی بلبلاہٹ کی خاطر۔ فاقوں کی سختی سے نڈھال جوانیوں کی خاطر۔ اور بوڑھی زندگیوں کی بے کسی کے لئے للہ آپ لوگ کالج نہ جائیں۔"

انجم کا دل کانپ اُٹھا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ اور اُس نے کار ایک کنارے لگا دی۔

نوجوان کی نظریں نرگس کے چہرہ پر جمی تھیں۔ بے تابانہ اور بے اختیار۔ انجم نے بھی ایک اچٹتی ہوئی نظر نرگس پر ڈالتے ہوئے نوجوان کے احساسات کا اندازہ لگانا چاہا مگر ناکام رہی۔ انجم سے نگاہ چار ہوتے ہی نوجوان گھبرا گیا اور اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ مگر انجم اس کی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے خمار کے سیلاب میں ڈوب کر رہ گئی۔

اب تک انجم یہ سمجھتی تھی کہ نرگس یا افسانہ نگاری سے اسے جو قلبی

لگاؤ ہے وہ ہی وہ محبت ہے جس کے گیت دنیا گاتی ہے لیکن اب
اُسے معلوم ہوا کہ محبت کا جذبہ اس لگاؤ سے بالاتر ہے۔ نوجوان والنٹیر
کے حسن کی لطافت نے ایک ہی جھلک میں محبت کا راز اُس پر ظاہر
کر دیا۔ اب وہ اُداس سی رہنے لگی۔ رہ رہ کر دل میں ایک ٹیس سی اُٹھتی
تھی اور وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ حتیٰ کہ افسانہ نگاری بھی اُسے بے کیف
معلوم ہونے لگی۔

نرگس اس کے حال سے بے خبر نہ تھی۔ مگر غم کا راز کیا تھا یہ اُس
کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کئی مرتبہ اس نے انجم سے تفکرات کی وجہ بھی
دریافت کی مگر اُس نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹال دیا۔ انجم کی
افسردگی نے نرگس کو بھی رنجور بنا دیا تھا۔

ایک دن دونوں سہیلیاں سینما گئی ہوئی تھیں۔ تماشہ گو دلچسپ
تھا مگر انجم اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی خاموش تھی۔ نرگس نے اُسے
تماشہ کی طرف رجوع کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ انٹرول
میں انجم یہ دیکھ کر خوشی کی رو میں بہ گئی کہ اس کے دل میں یاد پن کرنے
والا نوجوان والنٹیر اپنے دوست کے ساتھ سامنے ہی بیٹھا تھا۔ محبت کی
رنشوں نے اس کے احساسات کے تاروں کو چھیڑ کر پرکیف نغمہ
چھیڑ دیا۔ انجم نے بیخود ہو کر نرگس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ مگر
افت! نرگس کی نظریں بھی نوجوان پر لگی تھیں۔ انجم کے جذبات کے
نغمہ ریزہ ریزہ تار جھنجھنا کر ٹوٹ گئے۔ بہن نرگس کیا قصیدہ کے

لئے نئے مضمون کی تلاش ہے؟
"تمھاری ناول کے ہیرو کے لئے حسن کی دنیا ڈھونڈھ رہی ہوں"۔
نرگس نے جواباً کہا۔
انجم بولی "تم ہی سمیٹ لو اسے اپنے قصیدے میں"۔
اتنے میں تماشہ پھر شروع ہو گیا۔ اور دونوں سہیلیاں خاموش ہو گئیں۔ نہ معلوم کیوں۔

انجم اور نرگس آج بہت خوش تھیں۔ مقابلہ میں ہندوستان ایکیڈیمی نے انجم کی ناول کو سال کی تصنیف کردہ ناولوں میں سب سے بہتر قرار دے کر پہلا انعام عطا کیا تھا اور دونوں سہیلیاں آج انعام حاصل کرنے سوسائٹی کے پریسیڈنٹ خان بہادر مظفر جنگ کی کوٹھی پہ جا رہی تھیں۔

خان بہادر کے بنگلہ پہ پہونچ کر انجم نے ملاقاتی کارڈ بھجوا دیا۔ مگر چونکہ خان بہادر چند صاحبان کے ساتھ ضروری مشورہ میں مصروف تھے اس لئے انجم اور نرگس پائین باغ کی روش پر ٹہلنے لگیں۔
یکایک انجم کی نظر لیموں کے درخت کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں اس کا مجنوں نوجوان اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا ناول دیکھ رہا تھا۔
انجم کے سینہ میں بجلی سی دوڑ گئی۔ واقعی وہ کتنی خوش نصیب تھی کہ ہر جگہ اُسے اپنے محبوب کا دیدار ہو جاتا تھا۔

دوست نے پوچھا "انور کیا یہ وہی ناول ہے جس کو مقابلہ میں پہلا

انعام ملا ہے؟

"ہاں" انور نے جواب دیا "سیکنڈ ایر کی ایک لڑکی انجم آرا بیگم نے ذوق ادب کا بے نظیر نمونہ پیش کیا ہے۔"

اپنی تعریف سنتے ہی انجم کا دل فرط خوشی میں جھوم گیا۔ نرگس نے اس کے شانے ہلائے۔ "انجم مجھے دعائیں دو۔ میرے اصرار پر ہی یہ ناول مقابلے میں شامل ہوئی ورنہ تم کب بھیجنے والی تھیں۔"

قبل اس کے کہ انجم کچھ جواب دیتی انور کے دوست نے کہا "ناول کے ٹائیٹل پر اشعار بھی کتنے لطیف ہیں۔" انور نے کہا "ہاں" اور شعر گنگنانے لگا۔ انجم نے نرگس کے چٹکی لی۔ "نرگس تم نے سنا اشعار بھی کتنے لطیف ہیں۔"

انجم کو انعام دیتے ہوئے خان بہادر نے انجم اور نرگس کا تعارف انور سے کرا دیا تھا اس لئے اب وہ برابر ان سے ملتا رہتا تھا اور ان سے اس درجہ مانوس ہو گیا تھا کہ انجم محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے لیکن جب وہ نرگس کی تعریفیں کرتا اور یا نرگس سے بے تکلفانہ باتیں کرتا تو انجم کا دل اس کے خیالات کی مخالفت کرنے لگتا۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ انور نرگس سے محبت کرتا ہے۔

اس خیال نے رفتہ رفتہ پرورش پا کر انجم کے سینے میں حسد و بغض کے شعلے بھڑکا دئے۔ اور وہ اپنے دل میں نرگس کے خلاف باغیانہ جذبہ محسوس کرنے لگی۔

دن گزرے راتیں گزریں مگر نرگس کے خلاف جو احساس اس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا وہ نہ نکل سکا۔ اب اسے اپنے ماحول کی ہر چیز بے کیف نظر آنے لگی۔

افسانہ نگاری ختم ہوگئی۔ نرگس کا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ اب وہ تھی اور غم و آلام کے ہلاک کن تھپیڑے۔ ہر وقت اُس کے دماغ میں یہی خیال گھومتا رہتا کہ انور نرگس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اب نرگس سے بہت دور ہوگئی تھی بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کو نرگس سے نفرت ہوگئی تھی لیکن نرگس کے دل سے انجم کا خیال نہ نکل سکا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ انجم اس سے دور رہنا چاہتی ہے مگر وہ خود اس سے دور نہ رہ سکتی تھی۔ انجم کی بے رخی نے نرگس کی جان پر بنا دی۔

ایک صبح کو نرگس انجم سے ملی اور ہنس کر بولی "بہن انجم۔ اب تو تمھاری صورت دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ آخر کیا قصور کیا ہے میں نے جس کی ایسی سخت سزا دے رہی ہو۔"

انجم نے بے رخی سے جواب دیا "فرصت ہی نہیں ملتی کاموں سے۔"

انجم کے اس جواب نے نرگس کے دل پر گہری چوٹ دی۔ اُس نے مایوس لہجہ میں کہا "چند دن پہلے بھی تو یہ ہی مصروفیتیں تھیں؟"

انجم نے ٹالتے ہوئے کہا "اچھا کالج میں ملوں گی۔"

نرگس بولی "آج میں کالج نہیں جا رہی ہوں۔ میری خوشی ہے کہ شام کو میرے کمرہ میں ملو۔"

"اچھا ملونگی۔" انجم گویا سر سے بلا ٹالنا چاہتی تھی۔ مگر نرگس مصر ہوگئی۔ "انجم تمھیں پاک پروردگار کی قسم ضرور تکلیف کر کے آنا۔ صرف آج۔ آخری بار۔"

انجم مجبوراً وعدہ کر بیٹھی۔

شام کا وقت تھا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی شعاعیں درختوں کی بالائی شاخوں پر وداعی نظر ڈال رہی تھیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے خوشی کے راگ الاپ رہے تھے۔ انجم آزاد پرندے کی طرح انور کے ساتھ فضا کی رنگینیوں سے لطف اندوز

ہو رہی تھی۔ اسے تفریح کی ساعتوں میں نرگس کا خیال آیا نہ ملاقات کے وعدہ کا دھیان۔

قریب آٹھ بجے انجم گھر واپس آئی اور صوفے پر لیٹ کر "مورا ساجن الیلا ری گئیاں" گنگنانے لگی۔ اِتنے میں خادمہ نے نرگس کا خط لا کر دیا۔ اسے دیکھتے ہی انجم کا دم گھُٹ گیا۔ لکھا تھا۔

بہن انجم!

میری دلی تمنا تھی کہ زندگی کی آخری سانس تمہاری گود میں لوں اِس لئے تم سے شام کی ملاقات کی درخواست کی تھی۔ مگر میری بدنصیبی کہ تم کو فرصت نہ مل سکی۔ بے کافی انتظار کے بعد رخصت ہوتی ہوں۔ تم کو انور کی محبت مبارک ہو۔ میں تمہاری محبت کے راستے میں روڑا نہ بن کر نہیں جی سکتی تھی۔ الوداع۔

نظروں سے گری ہوئی بدنصیب۔ نرگس۔

انجم کو اب یارائے ضبط نہ رہا۔ غم و ندامت کی ضربوں سے اُس کا کلیجہ پھٹ چکا تھا۔ وہ بدحواس بھاگی ہوئی نرگس کے یہاں گئی۔ وہاں کا روح فرسا منظر دیکھ کر اس کا دم گھٹ گیا۔ اُس کی نرگس زندگی کی آخری ہچکی لے رہی تھی۔ انجم نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ نرگس نے نیم وا آنکھوں سے انجم کو دیکھا اور متورم رخساروں پر آنسو کے قطرے بہ آئے۔ ساتھ ہی طائر روح عالم بالا کو پرواز کر گیا۔ نرگس کے بعد انجم پھر چین سے کوئی گھڑی نہ گزار سکی۔ غم اُس کی زندگی کا جزو بن گیا تھا۔
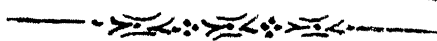
محبت کی جیت

نا ہید کے کالج جانے کا وقت تھا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ کہ شوکت دبے پاؤں کمرہ میں داخل ہوا مسکراتا ہوا۔

ہم سے چھپ چھپ کے سنورنے والے   چشم آئینہ تماشائی ہے

نا ہید شرما گئی۔ مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شوکت بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔" نا ہید تمھیں اپنے کالج کی میوزک کانفرنس میں کامیابی مبارک ہو"

"شکریہ" نا ہید نے کہا" مگر تم نے یہ کیا غضب کیا یہاں چلے آئے"

شوکت بولا" تمھیں انعام دینے کے لئے دل مچل رہا تھا چلا آیا معاف کرنا"

"لیکن ——"

شوکت پھر بول اُٹھا" میں ابھی اسلم کے یہاں گیا تھا معلوم ہوا کہ تمھاری امّی جان خادمہ کے ہمراہ ان کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ موقع لاجواب تھا۔ سیدھا یہاں چلا آیا۔

نا ہید شوکت کو محبت بھری نظروں سے دیکھ کر مسکرادی" دیکھتی ہوں اب بہت شریر ہوتے جا رہے ہو"

"بیشک" شوکت نے جواب دیا" مگر حوصلہ تمھیں بڑھا رہی ہو"
یہ کہتے ہوئے اُس نے مخملی ڈبیہ سے ایک انگشتری نکال کر نا ہید کی طرف

بڑھادی "خیر یہ ناچیز انعام قبول کرو۔ میری خاطر سے"

"شکریہ" ناہید کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ "کتنی مسکیف اور حسین

انگوٹھی ہے۔ نگینہ تو بے مثال ہے"

شوکت فرطِ خوشی سے جھوم گیا۔ گویا ناہید نے التفات کی دنیا اُس پر نثار

کردی۔ بولا "ناہید تمھیں یقین نہ ہوگا۔ میں نے نگینہ میں اپنا دل سمادیا ہے"

"میں دیکھ رہی ہوں۔ شوکت!" ناہید کی آواز جذبات کے سیلاب میں

بہہ گئی۔

شوکت مسکرادیا "شکریہ۔ دل چاہتا ہے میں اسے تمھاری انگلی میں پہنادوں"

ناہید نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اور شوکت نے اُس کی انگلی میں انگوٹھی پہنادی۔

ناہید کی لجائی ہوئی نظریں شوکت کی نگاہوں میں سمائی جا رہی تھیں جن میں

خمار کا عالم سمٹا ہوا تھا۔

ناہید نے کہا "جذبات کو روکو شوکت ورنہ پاگل ہو جاؤ گے"

شوکت بولا "محبت کی دیوانگی زندگی کی سب سے بڑی کا سیابی ہوگی ناہید!"

ناہید یکایک کسی گہرے خیال میں کھو گئی۔ شوکت نے پھر کہا "اگر دنیا نے

اب مجھے تم سے جدا کیا تو میں مر جاؤں گا"

ناہید نے قدرے شوخی سے مسکرا کر کہا "اطمینان رکھو میں تمھیں مرنے

نہیں دوں گی"

شوکت بولا "مگر اب تو ایک لمحہ کی جدائی بھی تڑپاتی ہے"

"گھبراؤ نہیں۔ نہ مروگے اور نہ تڑپوگے۔ شربت تیار کرکے لاتی ہوں۔

دو گھونٹ میں دل ٹھنڈا ہو جائے گا۔ ہر وقت کا رونا اور درد کے شکوے اچھے نہیں ہوتے"

یہ کہہ کر ناہید شربت لینے چلی گئی۔ اور شوکت تمناؤں کی موجوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔

ناہید اور شوکت کی ملاقات ایک تفریح گاہ میں ہوئی تھی۔ ناہید اپنی سہیلی شمشہ کے ساتھ جو شوکت کی خالہ زاد بہن تھی۔ تفریح کی غرض سے گئی تھی اور شوکت ستار کے راگ چھیڑنے گیا تھا۔ شمشہ نے دونوں کا تعارف کرا دیا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور دل ملنے میں بھی دیر نہ ہوئی جیسے فولاد نے مقناطیس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ دونوں کے دل جوانی کی اُمنگوں سے لبریز تھے۔ ناہید گاتی خوب تھی اور شوکت ستار لاجواب بجاتا تھا۔

ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ چھپ چھپ کر اور محبت کی پینگیں بڑھتی رہیں کچھ اس طرح کہ دونوں محبت کے نشے میں دنیا کو بھول گئے۔

ناہید ایک متمول سوداگر کی اکلوتی بیٹی تھی اور شوکت ایک متوسط درجہ کے کلرک کا لڑکا تھا۔ شوکت جانتا تھا کہ دنیا امارت اور غربت کو کبھی یکجا نہیں ہونے دیتی پھر بھی شوکت کو اس کا غم نہ تھا۔ اُسے ناہید کی محبت پر بھروسہ تھا۔ اعتماد تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل تیرتے پھر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ شوکت حسب معمول ستار لئے باغ میں بیٹھا تھا۔

مگر وہ بچا نہیں رہا تھا۔ ستار ایک طرف پڑا تھا اور وہ خیالات کی رو میں بہا جا رہا تھا۔

"میں ناہید کی طرف اتنا کیوں کھنچا جا رہا ہوں ۔ وہ اتنی کیوں کھنچی آتی ہے"

وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ناہید آگئی "کیا سوچ رہے ہو شوکت؟"

شوکت کوئی جواب نہ دے سکا۔ گویا اس کی زبان مفلوج ہو گئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔

ناہید نے پھر کہا "بولو شوکت! کیا سوچ رہے ہو؟"

شوکت نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ میں تمھاری طرف اتنا کیوں کھنچا جا رہا ہوں ۔ دنیا کبھی مجھے تمھارے قریب نہ رہنے دے گی۔ میں غریب ہوں اور تم امیر"

ناہید نے کہا "تمھیں ہر وقت یہ ہی خبط رہتا ہے۔ بھلا آنے والی باتیں کون جانتا ہے اس کی فکر کیسی ۔ ڈر کیسا"

"ٹھیک ہے" شوکت نے گلوگیر آواز میں کہا۔ مگر دل نہیں مانتا۔ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ سوچنا ہی پڑتا ہے"

ناہید نے شوخی سے چٹکی لیتے ہوئے کہا "پاگل ہو تم ۔ ہزار بار کہہ چکی کہ ہمارے معاملات میں دنیا کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہو سکتا ۔ والد کے انتقال کے بعد امی نے مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا ہے۔ ہزاروں ناز و نعم سے پالا ہے۔ وہ میری خوشی کے سہارے جی رہی ہیں ۔ وہ مجھے تم سے کبھی جدا نہ رہنے دیں گی۔

وقت کے منتظر تم بھی ہو اور میں بھی ہوں۔ خدا مالک ہے۔ اُٹھو کچھ دیر روش پر گھومیں اور دل بہلائیں۔

یہ کہہ کر ناہید شوکت کو پھلواریوں کے قریب لے گئی اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُس کا دل بہلانے لگی۔

دن گذرتے گئے اور دنیا میں انقلابات ہوتے رہے۔ ناہید اور شوکت کی زندگیوں میں بھی انقلاب ہونا ضرور تھا۔ اب وہ ایک دوسرے سے جدا تھے اور مجبور۔ شوکت کے والد کا تبادلہ الہ آباد کا ہو گیا تھا اور وہ اُسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اُسے جانا ہی تھا مگر ناہید کا فراق اُس کی جان پر بنائے دے رہا تھا۔ وہ ہر وقت غم آلود خیالات میں ڈوبا رہتا۔ دنیا جیسے اس سے چھوٹ گئی تھی۔ اور وہ دنیا سے چھوٹ گیا تھا۔

ناہید بھی اپنے آپ کو ایسی دنیا میں پا رہی تھی جہاں تنہائی کے سوا کچھ نہ تھا۔

دونوں کے والدین اپنی اپنی طرف ان کی شادی کے لئے مصر تھے۔ ناہید کی ماں بیچاری رشتہ داروں کے منشا اور ناہید کی خوشی کے درمیان بے بس انسان کی طرح گھلی جا رہی تھیں۔ اُنھیں ناہید کی محبت کا حال اور اُس کے غم کی داستان معلوم تھی مگر اعزا اُنھیں مجبور کر رہے تھے کہ خاندان کی کوئی لڑکی باہر نہیں بیاہی گئی اور ناہید بھی خاندان میں ہی رہے گی۔

شوکت کے والدین اور احباب بھی اُسے چین نہ لینے دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح وہ شادی کے لئے رضامند ہو جائے اور وہ اُس کی محبت کے لاشہ پر شادی کے شادیانے

بجا کر دل کے ارمان پورے کریں۔

شوکت بیچارہ ٹالتا رہا۔ عرصہ تک ٹالتا رہا۔ مگر والدین کی ضد نہ ٹل سکی اور اُس کی شادی اس کے آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان دہلی کے ایک معزز خاندان میں کر دی گئی۔ ایسے خاندان میں جہاں سیکڑوں اعزا اور رشتہ داروں کے ہوتے ہوئے بارات کا خیر مقدم کرنے کے لئے صرف دلہن کی ماں اور چند پڑوسی تھے۔ اسے دولہا اور دلہن کی بد نصیبی کہا جائے یا خوش نصیبی ـــــ بہر حال شادی ہو نا تھی ہو گئی اور شبِ عروسی ہزاروں تمناؤں کو آغوش میں لئے آ پہنچی۔

کمرۂ عروس کے ایک گوشہ میں شوکت آرام کرسی پر متفکر پڑا تھا۔ ارد گرد سے بے خبر اور خیالات میں کھویا ہوا۔

دفعتاً کمرے کے دروازے پر قہقہوں کی سریلی آوازیں سنائی دیں اور پھر مکمل سکوت ہو گیا۔ اب شوکت کو کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اُس کے دل کی دھڑکن بے ربط اور تیز ہو گئی۔ اسے اپنی دنیا کی ملکہ ناہید یاد آ رہی تھی محبت کے عہد و پیماں یاد آرہے تھے۔ کتنے بھولے تھے وہ جب یہ سوچتے تھے کہ دنیا انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں رکھ سکتی۔

بے اختیار شوکت کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

"میرے سرتاج" مترنم آواز نے شوکت کو دفعتاً چونکا دیا۔

شوکت کی نظریں متحرک ہوئیں اور ناہید کے چہرہ پر جم کر رہ گئیں متحیر اور خوشی میں رقصاں۔

(رضیہ بیگم۔ گراسٹویٹ گرلز کالج الہ آباد)

شمع ارشد کے مقابل کھڑی اُس کی شیروانی کے بٹن بند کر رہی تھی۔ ارشد نے فرطِ محبت سے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ معاً اُس کا دل دھک سے ہو گیا۔

"اف! شمع۔ تمھیں تو بخار ہے۔"

"نہیں تو۔ تم کو یو نہی وہم ہوتا ہے۔" شمع نے ارشد کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہم کیسا۔" ارشد نے کہا "تمھارا بدن آگ کی طرح جل رہا ہے۔ آخر کیوں اپنی جان ہلاک کر رہی ہو تم ہی نے تو میرا حوصلہ بڑھایا تھا۔ اور لڑائی پر جانے کی ترغیب دی تھی۔ پھر اب فکر کیوں؟ پریشانی کیسی؟"

شمع نے ٹھنڈی سانس بھری "ہاں ارشد میں نے ہی تمھارا حوصلہ بڑھایا تھا۔ مگر اب میری ہمت کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ صبر کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ سوچتی ہوں تمھاری جدائی کیسے برداشت کروں گی۔"

اس پر ارشد افسردہ ہو گیا۔ "شمع میری زندگی بھی تو غموں سے لبریز ہو جائے گی۔ مگر میں تمھاری ہی ہمت کا سہارا لے کر جا رہا تھا۔ اب تم ہی حیران ہو رہی ہو۔"

شمع بولی " ارشد! بچپن سے میرا اور تمہارا ساتھ ہے۔ ہم نے ایک ہی ماحول میں پرورش پائی ہے ہم والدین کی آغوشِ محبت میں پل رہے تھے۔ اور ہمارے دل کی گہرائیوں میں ہماری محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی ہم ایک دوسرے کو اچھے معلوم ہونے لگے۔ پھر ہم ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگے۔ اور ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے۔ اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے ہم ایک دوسرے کی خوالیوں کی دنیا میں رہنے لگے۔ لیکن نہ میں کہہ سکتی ہوں اور نہ تم بتا سکتے ہو کہ کب ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہم آپس میں محبت کرتے ہیں۔ ایسی والہانہ محبت جو ہماری زندگی بن چکی ہے۔ شاید اس لئے کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے سامنے رہے۔ لیکن اب جدائی کے خیال نے ہمیں محبت کے صحیح درد سے آشنا کر دیا۔ اور مجھے یہ یقین ہے کہ میں تمہارے بغیر نہ جی سکوں گی " یہ کہتے ہوئے شمع کی آواز بھر آگئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ارشد بھی بے چین ہو گیا۔ مگر اپنے جذبات پر قابو کر کے بولا " جنگ کی تباہ کاریاں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ آج یورپ کے ہر ملک میں خونریزیاں ہو رہی ہیں۔ مرد، عورت، بوڑھے اور حتّٰی کہ بچے بھی اپنے ملک و قوم کی حفاظت کے لئے کس فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔ حکومت کی حفاظت کے لئے ہندوستانی افواج بھی جنگ کے میدانوں میں سینہ سپر ہیں۔ پھر ہم کیوں چند روزہ جدائی کے خوف سے اپنے فرض کی ادائیگی سے منہ موڑیں؟"

ارشد کی اس گفتگو نے شمع کے دل کو کسی قدر ڈھارس بندھائی اور اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا " ارشد! مجھے بھی احساس ہے کہ لڑائی

ہمارے گھروں میں آگئی ہے۔ اور ہمیں اپنی حفاظت خود کرنا ہے لیکن اِس ٹیس کو کیا کروں جو دل کو برمائے دیتی ہے۔ ارشد نے کہا "جدائی کی گھڑیاں مختصر ہوں گی۔ ہمیں اُن کو ہنستے ہوئے گزار دینا ہے۔ پھر ملک و قوم کی خدمت میں اگر ہماری محبت اور جانیں بھی قربان ہو جائیں تو یہ ہماری خوش نصیبی ہے"

شمع نے آنکھوں میں آنسو لاکر افسردہ لہجہ میں کہا "تقدیر سے کوئی جنگ نہیں کر سکتا" اور آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ مجروح اور رنجور۔

ارشد بولا "لیکن ابھی تو مجھے جانے میں کافی دن باقی ہیں ممکن ہے جنگ کا رُخ بدل جائے اور نہ بھی جاؤں"

ارشد نے یہ سچ کہا تھا مگر شمع یہ ہی سمجھی کہ بہلا رہا ہے۔ بولی۔ "ارشد! بھولو نہیں کہ ہندوستانی عورتوں کی زندگی کی ہر کروٹ میں غم لپٹا ہے۔ صعوبتیں سمائی ہیں۔ اور ہر سانس میں قربانیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ مرتی ہیں مٹتی ہیں مگر زبان پر حرف شکایت نہیں آتا۔ ان کے صبر و استقلال کی مثال دنیا نہیں پیش کر سکتی اور میں بھی ہندوستانی لڑکی ہوں۔ میں تم کو امیدوں سے لبریز مسکراہٹوں کے درمیان وداع کروں گی۔ وہ ہی امید جو ہر زندگی کے ساتھ ہے۔

اس پر ارشد کا دل بھر آیا اور آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ اُس نے کہا "شمع تم بخار کا علاج کر ڈالو میری خاطر"

"ضرور کروں گی" شمع نے پرحسرت نگاہیں ارشد کے چہرہ پر جما دیں۔

(۴)

بازار میں ارشد کی شکیب سے ملاقات ہو گئی۔ باچھیں کھلی ہوئیں۔ خوشی میں پھولے ہوئے۔ منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ ارشد نے کہا۔ "تکلیل ٹوٹ گئی کیا جو ادھر نکل آئے!"

شکیب بے اختیار ہنس دیا۔ "اور تم کہاں چرنے گئے تھے؟"

ارشد نے جواب دیا۔ "میں بھلا کہاں چرنے جاتا۔ گھانس کے سارے میدان تو تم صاف کر آئے ہو۔"

اب دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دئیے۔ ارشد نے پوچھا۔ "اچھا بھائی یہ بتاؤ آئے کب؟"

شکیب نے کہا۔ "چھ دن ہو گئے آئے ہوئے۔ مگر تمھارے دیدار نصیب نہ ہو سکے۔"

"ہاں بھائی" ارشد نے کہا۔ "ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ گیا تھا۔ خالہ جان وغیرہ تو بخیریت ہیں؟" "ہاں خدا کا شکر ہے۔" شکیب نے جواب دیا۔

ارشد نے پھر سوال کیا۔ "اور کوئی تازہ خبر؟"

"سنا نہیں کیا تم نے؟ میری شادی ہو رہی ہے۔" شکیب نے کسی قدر شرماتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

ارشد شکیب سے لپٹ گیا۔ "کس سے ہو رہی ہے؟ کب ہو رہی ہے؟"
شکیب نے ارشد کا شانہ جھنجھوڑ کر کہا۔ "اسی کے ساتھ ہو رہی ہے۔
جو میری خوشبوؤں کی حسین کلی ہے۔ تمناؤں کا مہکتا ہوا پھول ہے۔
اور جسے میں دیوانہ وار چاہتا ہوں"
"تب تو وہ بہت خوبصورت ہوگی" ارشد نے کہا۔
شکیب نے فخریہ انداز میں کہا۔ "میرے دل کو بھا گئی ہے۔ یہی اُس کا
حُسن ہے"
"بدھو ہو تم" ارشد بولا۔ "بھلا وہ بھی تم کو چاہتی ہیں"
ارشد نے کہا۔ "چاہتی نہ ہوتیں تو شادی کے لئے رضامند کیوں ہوتیں۔
میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انھیں بھی مجھ سے محبت ہو گئی ہے"
ارشد کو شکیب کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ اُس نے پھر جیسے کچھ سوچ کر پوچھا۔
"اور ہاں اُن کا نام کیا ہے؟"
"شمع" شکیب بولا۔
ارشد جیسے چونک پڑا۔ "شمع؟"
"ہاں۔ ہاں شمع ہی تو ہے" شکیب نے اپنے الفاظ پر زور دیتے
ہوئے کہا۔ "ممانی جان نے امی کو خط بھی لکھ دیا ہے رضامندی کا"
ارشد پر جیسے بجلی گر گئی۔ اُف اس نے کس معصومیت سے اپنے آپ کو
محبت کی بے پناہ رنگینیوں میں کھو دیا تھا۔ دنیا کی فریب کاریوں سے بے خبر اور
یہ سوچے بغیر کہ جو ہاتھ ارمانوں کی دنیا کی تعمیر میں مدد دے رہے ہیں۔ وہ ہی

اس میں ایک دن آگ بھی لگا سکتے ہیں۔ ارشد کا سر جھک گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا اور وہ شکیب کے پاس زیادہ نہ ٹھہر سکا۔ گھر آکر وہ اپنے کمرہ میں پڑ گیا۔ یاد ماضی نشتر کی طرح دل میں چبھ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ یقین کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر دل نہ مانتا تھا کہ شمع اسے فریب دے سکتی ہے۔ یکایک اسے خیال آیا کہ ممکن ہے شکیب نے اُسے دھوکا دیا ہو چنانچہ وہ شمع سے باتیں کرنے اُس کے مکان دوڑا گیا۔ مگر شمع کے کمرہ کے دروازہ پر ٹھٹک کر رہ گیا۔

"محبت! ہاں آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ کیوں؟" شمع شکیب سے کہہ رہی تھی۔

شکیب نے کہا "سچ شمع! تم مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو"

"شکریہ شکریہ" شمع کھل کھلا کر ہنس پڑی "جب ہی آپ میری جان لینا چاہتے ہیں"

"شمع میں تمھیں دل کی ملکہ بنانا چاہتا ہوں" شکیب کی آواز جذبات میں ڈوب گئی۔

"وہ تو میں ضرور بنونگی" شمع نے کہا "اچھا اب آپ تشریف لیجائیے۔ امی آتی ہونگی"

شمع یہ سب طنز سے کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجہ میں ناگواری تھی اور بیزاری مگر ارشد کے دل پر تو جیسے ہتھوڑے کی سی ضربیں لگ رہی تھیں۔ اسے محبت کی تباہ کاریوں کا آج دھیان آیا۔ اس کے جذباتِ محبت کی انگڑائیاں

دم توڑنے لگیں۔ در و دیوار اس پر ہنستے معلوم ہوئے مضحکہ خیز اور طنزیہ ہنسی، ایک خنجر سا اُس کے سینہ میں اُتر گیا۔ اور وہ زخمی شکار کی طرح اپنے مکان کو واپس بھاگا۔ پریشان۔ سراسیمہ اور دل شکستہ۔ اور جب وہ اپنے کمرے میں پہونچا تو یہ قبر کی طرح بھیانک اور تیرہ و تار معلوم ہونے لگا۔ وہ مسہری پر بیجان سا گر گیا۔ اس نے پھر محسوس کیا کہ اس کے بھروسے اور اور اعتماد کی دھجیاں اُڑتے دیکھ کر کمرے کی ہر چیز قہقہہ لگا رہی ہے۔ اُس کی طبیعت میں بیزاری کا طوفان اُمنڈ آیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر چیز کو چور کر کے اپنی زندگی کی سانسوں کا سلسلہ بھی توڑ دے اسے شمع سے نفرت ہو گئی تھی۔ اپنے آپ سے اور دنیا کی ہر شے سے وہ بیزار ہو گیا تھا لیکن دفعتاً اس کے خیالات نے کروٹ لی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ دنیا کے مکر و فریب سے گھبرا کر وہ اپنی جان کیوں ہلاک کرے شمع کی بے وفائی پر وہ بھی ہنسے گا۔ اور خوب ہنسے گا۔ مایوسی اور اداسی اگر اس کا سینہ چھلنی کر دینگی تو وہ بھی حقارت کے تیروں سے شمع کا دل چھید دیگا۔ اور یہ ہی ہوا۔ ارشد کی نظر پھر جانے کے بعد شمع کی دنیا اندھیری ہو گئی۔ اس کا دل موت کی سی گہری تاریکی میں ڈوب کر رہ گیا۔ وہ ہر وقت اُداس و غمگین اور کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ اسے اب اپنے ماحول کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ زندہ رہتے ہوئے بھی گویا مردہ اور بے جان تھی۔ اسے دنیا کی کسی چیز میں سکون کا پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ہر چیز۔ ہر مذاق اور ہر دلچسپی سے وہ اُکتائی ہوئی تھی۔ گھبرا اُٹھی تھی۔ کاش ارشد شمع کو اتنا موقع دیدیتا کہ وہ اس کے دل میں پیدا شدہ بدگمانی

دور کرنے کی کوشش کرسکتی تو آج زندگیاں اس طرح تباہ نہ ہوتیں۔ غم وفکر
گھن کی طرح شمع کی روح کو کھائے جا رہا تھا۔ گھر کے سب لوگ اس کی گرتی
ہوئی حالت کو دیکھ دیکھ کر پریشان تھے۔ شادی کی گھڑیاں سر پر آ رہی تھیں۔
اور وہ کم سنی بیچارگی کی شکار ہو کر بے جان پڑی تھی۔ سب کا خیال تھا کہ دق
ہو گیا ہے۔ لوگوں کی سرگوشیاں اسے ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا زہریلے سانپ
پھنکارتے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

(۴۳)

ارشد کو شمع کی بیماری کا حال معلوم تھا۔ مگر اس نے اپنا دل پتھر کی طرح
کر لیا تھا اور ایک مرتبہ بھی شمع سے ملنے نہ آیا کہ اس کی مردہ روح زندگی کی ایک
سانس لے سکتی۔

ارشد کی بہن لیلیٰ شمع کو دیکھنے آئی تھی۔ لیلیٰ کو دیکھتے ہی شمع کے دل پر
تازہ ٹھیس لگی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ مایوسی اور ناکامی کے آنسو۔
لیلیٰ اس کی یہ حالت دیکھ کر بیقرار ہو گئی۔ اس کا دل بھر آیا۔ اور اس نے محبت
سے شمع کے زرد اور لاغر چہرے کو اپنے زانو پر لے لیا۔ شمع کی سسکیاں تیز ہو گئیں
اور ہونٹ کانپنے لگے۔ لیلیٰ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بہن گھبراؤ نہیں۔ ڈاکٹر
کہتے ہیں تم جلد اچھی ہو جاؤ گی۔" شمع نے ٹھنڈی سانس بھر کر آنسو خشک کرتے
ہوئے کہا۔ "لیلیٰ مجھے جینے کی خواہش نہیں ہے۔ دل بھر گیا ہے زندگی سے۔
رونا تو کچھ یونہی سوچ کر آ گیا۔"

"آخر کیا بات ہے؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

شمع نے نحیف آواز میں کہا "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سنا ہے تم نے اپنے بھائی جان کا نکاح کر دیا ہے شمشہ کے ساتھ"؟

"ہاں" لیلیٰ نے کہا " خون پانی ہو گیا اس نکاح میں بھائی جان کسی طرح رضامند ہی نہ ہوتے تھے"۔

"صحیح" شمع نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ اور سوچ میں پڑ گئی کہ ارشد شادی کے لئے رضامند کیوں نہ ہوتا تھا کیا محبت کی خلش اب بھی اس کے دل میں زندہ تھی۔ اس نے پھر نہ معلوم کس جذبہ کے تحت کہنا شروع کیا۔ لیلیٰ بہن! میرے جینے کی اب کوئی امید نہیں۔ مر رہی ہوں۔ مجھے اس کا غم نہیں۔ صرف یہ ملال ہے کہ میرے ساتھ میری زندگی کا راز بھی فنا ہو جائے گا۔ جسے میں نے اب تک کسی کی امانت سمجھ کر دل میں محفوظ رکھا ہے۔ چاہتی ہوں اسے تمہارے سپرد کر دوں" اس کے بعد آنسو اور سسکیوں کے درمیان شمع نے اپنی داستانِ محبت اور رودادِ غم لیلیٰ کو سنائی۔ اور کہا "شکیب کے ساتھ میری شادی کی تیاریاں ضرور ہو رہی تھیں۔ مگر میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اپنی جان ہلاک کر دوں گی۔ مگر ارشد کی محبت کا خون نہ ہونے دوں گی لیکن آہ ایک دن میں شکیب کے چٹکیاں لے رہی تھی۔ اسے تنگ کر رہی تھی۔ اُسکے حوصلے کی دست درازی پر مگر میری باتوں نے ارشد کو غلط فہمی کا شکار کر دیا۔ اور وہ بدگمان ہو کر میری طرف سے کھنچ گئے۔ آج تک اُنھوں نے میری صورت نہیں دیکھی میری فریاد بھی نہیں سُنی کان بند کر لیئے میری پکار کے لئے۔۔۔۔۔

"اُف مجھے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ میری کشتیٔ حیات کو محبت

کے سیلاب میں پھنسا کر لب دریا کھڑے قہقہے لگائیں گے۔ اور خوش ہوں گے
میری تباہی پر۔ یہ کہتے ہوئے شمع کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ اور وہ آگے
کچھ نہ کہہ سکی۔ لیلیٰ کا دل بھی محبت کی بربادی پر خون کے آنسو رو دیا! اُف
کتنا المناک انجام تھا معمولی سی بدگمانی کا۔ لیلیٰ نے اپنے جذبات کو قابو
میں کر کے شمع کے دل کو ڈھارس بندھانے کی کوشش کی مگر کس حد تک
کامیاب ہوئی۔ یہ وہ خود بھی نہ سمجھ سکی۔

گھر پہنچ کر اس نے شمع کی بے کسی اور مجبوری کا حال ارشد کو سنایا۔
رو رو کر اور ایسے درد بھرے لہجہ میں کہ ارشد کی آنکھیں بھی رو پڑیں اور وہ
بدحواس دوڑا ہوا شمع کے پاس پہنچا۔ شمع اُسے اپنے پاس دیکھ کر خوشی کے
آنسو رو پڑی۔ ارشد خاموش بیٹھا تھا۔ نادم اور افسردہ۔ فرطِ الم سے
اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ ناکامی کی ضربوں سے اس کا دل
گھلا جا رہا تھا۔

غم بھری آہیں۔ اور آنکھوں سے بہتے ہوئے گرم آنسو ہی اب محبت
کے ناکام متوالوں کی زندگی تھی۔

حریت فریدہ۔ کراسٹویٹ گرلز کالج
الہ آباد

تمت بالخیر

سلیمی برقی پریس یحییٰ پور الہ آباد